تدبّرِ قرآن

۷

الاعراف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ انعام میں، جیسا کہ تفصیل سے واضح ہوا، قریش کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اس بنیاد پر دی گئی ہے کہ یہی اصل ملت ابراہیمؑ ہے جس کی ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو تلقین کی نہ کہ وہ مجموعۂ بدعات واوہام جو تم لیے بیٹھے ہو۔ اللہ نے تم پر بڑا فضل فرمایا ہے کہ اس نے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جس نے اللہ کی حجت تم پر پوری کر دی ہے۔ اب تمھارے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو خدا نے ہمیشہ تباہ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک معروف حقیقت ہے جس کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے تمھیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک میں تم آج باقتدار ہو خود اسی کی تاریخ میں تمھارے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ تم اس سرزمین پر پہلے آنے والے نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جو اسی طرح اقتدار کی مالک ہوئیں جس طرح تم۔ بلکہ بعض اپنے اقتدار و سطوت کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انھی کے وارث تم ہوئے ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدرت کا قانون تمھارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔ ان کے جن جرائم کی بنا پر خدا نے ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ تم کو بخشی، انھی جرائم کے مرتکب تم ہوئے تو خدا تم کو دندناتے پھرنے کے لیے کیوں چھوڑے رکھے گا، خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔

انعام کے بعد اعراف، انعام کی مثنیٰ سورہ ہے۔ اس میں دعوت کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں صاف صاف قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو بس سمجھ لو کہ اب تم خدا کے عذاب کی زد میں ہو۔ اس میں پہلے ان کی فرد قرار داد جرم کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان تمام پچھلی قوموں کی تاریخ سنائی جو اس ملک میں اقتدار پر آئیں اور پھر یکے بعد دیگرے اسی جرم میں کیفر کردار کو پہنچیں جس کے مرتکب قریش ہوئے۔ یہ تفصیل گویا انعام کی آخری آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی بالکل آخری تنبیہ فرمائی ہے۔ آخر میں عہد فطرت کو، جو تمام ذریت آدم سے لیا گیا ہے، بنیاد قرار دے کر انذار کے مضمون کو اس کے آخری نتائج تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد برأت، ہجرت اور اعلان جنگ یا نزول عذاب کے مراحل

سامنے آجاتے ہیں۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر نگاہ کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اس کتاب الٰہی سے متعلق تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کردو تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ تم پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول بھی کرلیں۔ اس سے فائدہ صرف اہلِ ایمان ہی اٹھائیں گے۔ قریش کو تنبیہ کہ اس کتاب کو قبول کرو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک ہو چکی ہیں اور جب خدا کا عذاب ان پر آیا تو اس کے مقابل میں وہ کوئی بند نہ باندھ سکیں بلکہ انھوں نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور عذاب الٰہی کی پکڑ میں آگئیں۔ پھر تم پر ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں تم سے تمھاری ذمہ داریوں کے بابت پرسش ہونی ہے اور رسول سے اس کی ذمہ داری کے بابت۔ اس دن سارا کچا چٹھا ہم سب کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس دن جو میزانِ عدل نصب ہوگی وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ کس کے پاس کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اس دن فلاح صرف وہی پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ باقی سب نامراد ہوں گے۔

(۱۰-۲۵) قریش کو تنبیہ کہ اس ملک میں تمھیں جو اقتدار حاصل ہوا، خدا ہی کا بخشا ہوا ہے۔ اسی نے تمھارے لیے معاش و معیشت کی راہیں فراخ کیں۔ لیکن شیطان نے تم پر حاوی ہو کر تم کو ناشکری کی راہ پر ڈال دیا۔ آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیطان نے ذریتِ آدم کو جو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کو اپنی چالوں سے گمراہ کر کے چھوڑے گا، ان کی اکثریت خدا کی نافرمان و ناشکری بن جائے گی، اس نے اپنی وہ دھمکی تمھارے اوپر سچ کر دکھائی۔ جس طرح اس نے آدم و حوا کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوایا اسی طرح اس نے اپنا فریب تم پر چلایا ہے تو تم شیطان کے چکموں میں آکر اس کی امیدیں برآنے کے سامان نہ کرو۔

(۲۶-۳۰) یہ تذکیر کہ تم نے آدمؑ کی اولاد ہو کر شیطان کی اس دشمنی کو یاد نہ رکھا جو اس نے تمھارے باپ کے ساتھ کی۔ اس نے انھیں فتنے میں ڈالا اور حلۂ جنت سے محروم کر کے جنت سے نکلوایا۔ وہی کھیل وہ تمھارے ساتھ کھیلا ہے۔ خدا نے تم کو ظاہر و باطن کے جس لباس سے مزین کرنا چاہا شیطان کی اطاعت میں تم نے وہ دونوں جامے اتار پھینکے۔ تقویٰ کا لباس بھی جو باطن کی زینت ہے، اتار کر پھینک دیا اور ظاہر کا لباس بھی اتار دیا چنانچہ عین حرم الٰہی میں، اس نے تمھیں عریاں طواف پر ورغلایا اور تم اس بے حیائی کو نہ صرف باپ دادا کی وراثت سمجھتے ہو بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا حکم تمھیں خدا نے دیا ہے۔ سوچو کہ خدا ایسی بے حیائی کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ خدا نے تو ہر باب میں صرف حق و عدل کا حکم دیا ہے، صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، توحید کا حکم دیا ہے۔ تم نے شیطان کی پیروی میں اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کیا اور دعویٰ کرتے ہو

کہ یہی راہ ہدایت کی راہ ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکے۔

(۲۱-۳۴) قریش کو تنبیہ کہ اپنے جی سے تم نے یہ جو حرام و حلال بنا رکھا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ خدا نے نہ تو زینت حرام کی ہے اور نہ کھانے پینے کی چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ دنیا میں بھی اہل ایمان کے لیے مباح ہیں اور آخرت میں تو وہ ان کے بلا شرکت غیرے حق دار ہوں گے ہی۔ خدا نے حرام بے حیائی کو ٹھہرایا ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، حق تلفی اور سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا کوئی جواز نہیں، شرک کو ٹھہرایا ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں اور اللہ کے اوپر افترا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن تم ان ساری ہی باتوں کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اگر اس کے باوجود تمھیں مہلت مل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں ہر امت کی تباہی کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

(۳۵-۴۳) اس امر کی یاددہانی کہ ذریت آدم کو ابتدا ہی میں یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے گا تو جو لوگ ان رسولوں کی پیروی کریں گے وہ جنت حاصل کریں گے، جو ان کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ یہ دوزخ میں پڑنے والے سب ایک دوسرے کے اوپر لعنت بھیجیں گے اور ان کو کسی طرح دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ بس دوزخ کی آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنے گی۔ البتہ جو اہل ایمان ہوں گے وہ جنت حاصل کریں گے اور وہ باہمگر ایک دوسرے کی ملاقات سے مسرور اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں پر شکرگزار رہوں گے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ یہ ہمیں جو کچھ خدا نے بخشا اپنے رسولوں کی پیروی کے طفیل بخشا۔ رسولوں نے جو کچھ فرمایا سب حرف حرف سچ ثابت ہوا۔

(۴۴-۵۳) اہل جنت کا اہل دوزخ سے خطاب کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بحرف پورے ہوئے، تم بتاؤ کہ تم نے بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا یا نہیں جس سے تمھیں آگاہ کیا گیا تھا؟ اہل دوزخ پر خدا کی طرف سے لعنت کا اعلان۔ اس امر کا بیان کہ مقام اعراف سے اہل ایمان کے ایک گروہ کو دوزخ اور جنت دونوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خدا نے رسولوں کے ذریعے سے جن باتوں کی خبر دی تھی وہ سب پوری ہوئیں۔ اصحاب اعراف کی طرف سے اہل جنت کو مبارک باد اور اہل دوزخ کو ملامت۔ اہل دوزخ کی اہل جنت سے فریاد کہ وہ ان پر کچھ کرم کریں۔ اہل جنت کی طرف سے جواب کہ جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کہ جنھوں نے دنیا میں خدا کی باتوں کو نظر انداز کیا آج خدا نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کفار کی طرف سے اپنی محرومی و بدبختی پر اظہار حسرت۔

(۵۴-۵۸) کفار قریش کو تنبیہ کہ خلق و امر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے تو امید و بیم ہر حالت میں اسی کو پکارو۔ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ تم اس کائنات میں برابر کر رہے ہو۔ خدا نے ہر پہلو سے اپنی آیات واضح فرما دی ہیں۔

(۵۹-۹۳) قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ کی سرگزشتیں، جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہیں کہ جو قومیں فساد فی الارض کی مرتکب ہوتی اور اپنے رسول کی دعوت اصلاح کی تکذیب کر دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ان

کو صفحہ ارض سے مٹا دیتا ہے۔

(۹۴-۱۰۲) مذکورہ بالا سرگزشتوں پر ایک اجمالی تبصرہ۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے اس کے بعض بنیادی اصول اور بعض حکمتیں اور عبرتیں۔ قریش کو یہ تنبیہ کہ انہی کے خلف تم ہو لو اگر تم دیدۂ عبرت سے دیکھتے تو تمھارے اپنے ملک کی تاریخ میں تمھارے لیے کافی سامان بصیرت موجود ہے لیکن جس طرح ان قوموں کے دلوں پر اللہ کی مہر لگ گئی تھی اسی طرح تمھارے دلوں پر بھی اللہ کی مہر لگ چکی ہے۔

(۱۰۳-۱۳۶) حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو شکست دینے کے لیے تمام ہتھکنڈے، جو اس کے امکان میں تھے، استعمال کیے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بامراد کیا اور فرعون کو، تمام اسباب و وسائل کے علی الرغم شکست دی۔ مفسدین کا بیڑا غرق ہوا اور جو جماعت مظلوم و مقہور تھی خدا نے اس کو، اس کی استقامت کی بدولت، زمین میں اقتدار بخشا۔

(۱۳۷-۱۷۱) بنی اسرائیل کی تاریخ کے تمام ادوار پر ایک جامع تبصرہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ بڑے بڑے کرم فرمائے لیکن انھوں نے شروع سے لے کر اب تک ہمیشہ حدائے انعامات کی ناقدری کی اور کسی تذکیر و تنبیہ سے بھی کوئی پائدار فائدہ نہیں اٹھایا اور اب بھی ان کی روش وہی ہے چنانچہ جس حق کی علمبرداری کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی وہ اس کی مخالفت میں پیش پیش ہیں حالانکہ یہ موقع ان کے لیے آخری موقع ہے جس کو ضائع کر دینے کے بعد ان کے لیے دائمی ذلت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۱۷۲-۲۰۶) خاتمۂ سورہ جس میں قریش کو عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے اور بنی اسرائیل کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر ان کو عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی پکڑ میں آجاؤ گے تو تمھارے یہ اولیا و اصنام جو تم نے گھڑ رکھے ہیں کچھ کام نہیں آئیں گے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر، اعراض اور ہر آن یاد الٰہی کے ساتھ وابستہ رہنے کی ہدایت۔

سُورَةُ الاَعۡرَافِ (۷)

مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۲۰۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

آیات ۱ - ۹

الٓمّٓصٓ ۚ‏ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَكَمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَيَاتًا اَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعۡوٰٮهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ‌ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ﴿۷﴾ وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ ۨالۡحَـقُّ‌ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸﴾ وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

یہ الٓمّٓصٓ ہے۔ یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہلِ ایمان کے لیے یاددہانی ہے۔ لوگو، جو چیز تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب

سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ بہت کم ہی تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دھاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے۔ تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ سو یاد رکھو، ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار اور اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ ۱-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲-۱)

'الٓمّٓصٓ' حروف مقطعات پر تفصیلی بحث بقرہ میں الٓمّٓ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں الف، لام، میم پر حرف ص کا اضافہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ جن سورتوں کے نام کچھ مشترک سے ہیں ان کے مطالب میں بھی فی الجملہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بہت سی باتیں بقرہ سے ملتی جلتی ہیں اگرچہ دونوں میں مکی و مدنی کا فرق بھی ہے اور دونوں کے مخاطب بھی الگ الگ ہیں۔

یہاں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ الٓمّٓصٓ کو بحذف مبتدا مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو آگے سے ملانا چاہیں تو اس کو مبتدا اور 'كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ' کو اس کی خبر بھی مان سکتے ہیں۔ ہم نے پہلی شکل اختیار کی ہے اور 'كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ' میں بھی مبتدا کو محذوف مانا ہے۔ ویسے دونوں شکلوں میں باعتبار مفہوم کوئی فرق نہیں ہے۔

'کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ' حرج، کے معنی تنگی، ضیق اور پریشانی کے ہیں، یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ یہ دور، جیسا کہ سورہ کے مطالب کی فہرست سے واضح ہے، قریش کی مخالفت کے شباب کا دور تھا۔ وہ ہر قسم کے اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے تھے۔ آپ کو زچ کرنے کے لیے روز نت نئے مطالبے وہ پیش کرتے۔ ایک طرف مخالفت کی یہ شدت تھی دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرض دعوت کا احساس اتنا شدید تھا کہ سارے جتن کرنے کے باوجود آپ کو یہ فکر دامن گیر ہی رہتی کہ مبادا میری ہی کوئی کوتاہی ہو جس کے سبب سے یہ لوگ اتنی صاف اور واضح حقیقت کے قائل نہ ہو رہے ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مل کر آپ کے دل پر ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ قرآن نے یہاں یہ دونوں بوجھ ہلکے کیے ہیں۔ قریش کی مخالفت سے بے پروا ہونے کی یوں تلقین فرمائی کہ یہ کتاب نہ تمہاری اپنی پیش کردہ ہے نہ خدا سے درخواست کر کے تم نے اپنے اوپر اتروائی ہے بلکہ یہ تمہاری طلب و تمنا کے بغیر خدا کی طرف سے تم پر اتاری گئی ہے تو تم اس کے مخالفوں کی مخالفت سے اپنے آپ کو ضیق و پریشانی میں کیوں مبتلا کرو؟ جس خدا نے یہ اتاری ہے وہی اس کی تائید و نصرت کے لیے کمک اور بدرقہ بھی فراہم کرے گا۔ نہ وہ کوئی کمزور ہستی ہے نہ حالات سے بے تعلق یا بے خبر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جو ذمہ داری اس نے تم پر ڈالی ہے اس کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لیے تم کن چیزوں کے محتاج ہو اور راہ کے پتھروں کو ہٹانے کے لیے تمہیں کتنی قوت درکار ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں فراہم کرے گا تو تم خاطر جمع رکھو اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔

'لِتُنْذِرَ بِہٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ' یہ اس کتاب سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو تکذیب رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح ہوشیار کر دیں۔ یہ مانتے ہیں یا نہیں، یہ سوال آپ سے متعلق نہیں ہے۔ آپ پر ذمہ داری صرف انذار و بلاغ کی ہے۔ 'وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ' کا ٹکڑا معناً عطف تو 'لِتُنْذِرَ' ہی پر ہے لیکن یہ فعل کے بجائے اسم کی شکل میں ہے۔ اس کے اسم کی شکل میں لانے سے ایک امر واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو تم ان کفار کو کر دو لیکن اس سے یاد دہانی کا فائدہ صرف اہل ایمان ہی اٹھائیں گے۔ یہ مضمون جگہ جگہ، قرآن میں مختلف سورتوں میں، بیان ہوا ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ طٰہٰ۔ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی اِلَّا تَذْکِرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی۔ طٰہٰ ۱-۴ (یہ سورہ طٰہٰ ہے، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تمہاری زندگی تمہارے لیے اجیرن ہو کے رہ جائے، یہ تو بس یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈریں، یہ تو نہایت اہتمام سے اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور ان بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (۳)

قریش کی مخالفت کے دور شباب میں آنحضرت صلعم کو تسلی اور آپ کی ذمہ داری کی حد

کفار قریش کو عذاب کی دھمکی

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو مانا ہے لیکن سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ دلیل ہیں کہ خطاب کفار قریش سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر والی آیت میں تسلی دینے کے بعد اب یہ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ یہ چیز جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے ماسوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرو، یہ خیالی اولیاء و اصنام تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد باندازِ حسرت و افسوس فرمایا کہ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ کہ تم ایسے شامت زدہ لوگ ہو کہ مشکل ہی سے یاددہانی حاصل کرتے ہو۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَآئِلُونَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ إِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَآ إِلَّآ أَنْ قَالُوٓا إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِينَ (۴-۵)

'قریہ' کا مفہوم

'قَرْيَة' کا لفظ قریہ اور اہل قریہ دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں، اشارات اور فعل وغیرہ استعمال کرنے میں، کبھی لفظ کا اعتبار کرتے ہیں، کبھی مفہوم کا۔ یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔
'قَآئِلُونَ'، قیلولہ سے ہے۔ قیلولہ کے معنی دوپہر منانے کے ہیں، سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ عرب کا ملک، گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مکانوں، ڈیروں، خیموں اور باغوں میں آرام کریں۔

اہل تاویل کی ایک غلط فہمی

بعض اہل تاویل کو فَجَآءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَآئِلُونَ کے الفاظ سے یہ خیال ہوا ہے کہ اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب لوگ رات میں یا دن میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ بات تاریخ کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی۔ سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُونَ ۔۴۷ (کہو، بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک چپکے سے یا کھلم کھلا آدھمکے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا؟) اسی سورہ اعراف میں معذب قوموں کی سرگزشتیں سنانے کے بعد ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰىٓ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُونَ ۝ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰىٓ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُونَ ۔۷-۹۸ (کیا یہ بستیوں والے مامون ہوتے اس بات سے کہ ہمارا عذاب ان پر رات میں آدھمکے جب وہ سوتے ہوئے ہوں! کیا یہ بستیوں والے مامون رہے کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آدھمکے جب کہ وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں) ہمارے نزدیک 'فَجَآءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَآئِلُونَ' سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے کہ خدا کا عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب لوگ سوئے ہوتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے بھی آیا اور ڈنکے کی چوٹ دن دھاڑے بھی۔ جس وقت بھی آیا آگیا، نہ کوئی اس کو روک سکا اور نہ کوئی اس سے اپنے کو بچا سکا۔ صرف وہ لوگ اس سے بچ سکے جن کو اللہ کی امان حاصل ہوئی۔

اصل انذار

یہ وہ انذار رہے جس کا لَتُنْذِرَ بِهٖ میں اشارہ ہے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ کتنی قومیں اور بستیاں ہیں

جن پر رات میں یا دن میں جب خدا نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا اور وہ تباہ کر دی گئیں، ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابل میں کھڑی نہ ہو سکی بلکہ ہر قوم نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے حوالہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی اس چیز کی پیروی نہ کی جو خدا نے تم پر اتاری ہے تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔ آج اکڑتے ہو لیکن اس وقت سارے کس بل نکل جائیں گے اور تم خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار کرو گے لیکن اس وقت یہ اقرار تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہوگا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ ۝ وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ (۶-۹)

انذار کی تفصیل

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ کے رسول دو چیزوں سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کرنے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس جزا و سزا سے جس سے آخرت میں ہر شخص کو لازماً دوچار ہونا ہے۔ اوپر والی آیت میں پہلی چیز سے ڈرایا ہے۔ اب آگے اس دوسری چیز سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہم ان اُمتوں سے بھی پرسش کریں گے جن کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے اور خود رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اُمتوں سے جو پرسش ہونی ہے اس کی تفصیل قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ	جب جب ان کی کوئی بھیڑ دوزخ میں جھونکی جائے گی
خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝	اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمہارے پاس
قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا	کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں
وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۚ	ہمارے پاس ایک ہوشیار کرنے والا آیا تو تھا پر ہم نے اس
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝	کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری
وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ	ہے، تم لوگ ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ وہ
مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝	اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سنتے سمجھتے ہوتے تو جہنم میں پڑنے
فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ	والے نہ بنتے۔ بس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو لعنت ہو
السَّعِیْرِ۔ ملک ۸-۱۱	ان دوزخیوں پر۔

رسولوں سے جو سوال ہوگا اس کا حوالہ سورہ مائدہ میں یوں دیا گیا ہے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ	جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تمہیں
مَاذَآ اُجِبْتُمْ۔ ۱۰۹-مائدہ	کیا جواب ملا؟

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ، مطلب یہ ہے کہ اس دن ہم رسولوں اور اُن کی قوموں کو ساری

گزری ہوئی روداد. پورے علم و خبر کے ساتھ سنا دیں گے کہ ہمارے رسولوں نے کس طرح حق بلاغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے کس طرح جان بوجھ کر ان کی تکذیب کی. فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات وواقعات سے بے تعلق یا بے خبر نہیں رہے ہیں. جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے ہوا ہے. یہ واضح رہے کہ یہ سنانا قطع عذر کے لیے ہوگا تاکہ کسی کے لیے بھی لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے.

میزانِ قیامت میں وزن دار صرف حق ہوگا

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ، مطلب یہ ہے کہ اس دن وزن رکھنے والی شے صرف حق ہوگا. باطل میں سرے سے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا. قیامت میں اللہ تعالیٰ جو ترازو نصب فرمائے گا وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ اس میں حق کا حصہ کتنا ہے. پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے (یعنی حق کی مقدار ان کے ساتھ زیادہ ہوگی)، وہ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے. اعمال کے باوزن اور بے وزن ہونے کے باب میں قرآن نے یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے. هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًاؕ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًاؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۱۰۳-۱۰۵. (کہہ دو ہم تمہیں بتائیں گے کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہوں گے؟ وہ جن کی ساری سرگرمیاں طلبِ دنیا میں برباد ہوئیں اور وہ اس خوش گمانی میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ڈھے گئے، تو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن نہیں قائم کریں گے) اس سے معلوم ہوا کہ میزانِ قیامت میں وزن دار اعمال وہی ہوں گے جو خدا کی رضا اور آخرت کے لیے انجام دیے جائیں. جو اعمال اس وصف سے خالی ہوں گے نہ وہ اعمالِ حق ہیں، نہ میزانِ الٰہی میں ان کا کوئی وزن ہوگا.

زبان کا ایک اسلوب

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ...... بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ، ہم ایک سے زیادہ مقامات میں زبان کے اس اسلوب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب صلہ اور فعل میں مناسبت نہ ہو تو وہاں تضمین ہوتی ہے یعنی کوئی ایسا فعل وہاں محذوف مانیں گے جو موجود خلا کو بھر سکے. اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ کم استعمال ہوتے ہیں، لیکن معنی میں بہت وسعت ہو جاتی ہے. یہاں تضمین کھول دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَيَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَهُمْ، بوجہ اس کے وہ ہماری آیات کا انکار کرتے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے.

۲- آگے کا مضمون ____ آیات ۱۰-۲۵

پہلے قریش کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا احسان جتا کر ان کو ملامت کی کہ کس طرح اللہ نے تم کو اس سرزمین محترم میں قوت و شوکت دی، تم کو خوف سے بے خوف کیا اور تمھارے لیے معاش و معیشت کی راہیں

کھولیں لیکن تم خدا کے شکر گزار و فرمانبردار ہونے کے بجائے ناشکرے اور اس کے نافرمان ہو گئے۔

اس کے بعد آدمؑ و ابلیس کا وہ ماجرا جو بقرہ میں یہود کو سنایا گیا ہے بعض تفصیلات کے اضافہ کے ساتھ قریش کو سنایا کہ شیطان نے آدمؑ اور ان کی ذریت کی ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی وہ قسم جس طرح آدمؑ و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے ان پر پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کر لی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو اور اس کا جو نتیجہ تمہارے حق میں نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے —— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۵ ع ۱۰ ۸

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰي يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا
الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ
فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا
تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

ع ۲ ۹

ترجمہ آیات ۱۰ - ۲۵

اور ہم نے تمھیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمھارے لیے معاش کی راہیں کھولیں، پر تم بہت ہی کم شکر گزار رہوتے ہو۔ ۱۰

اور ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھاری صورت گری کی، پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، پھر تو یہاں سے اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے، تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے دے جس

دن لوگ اٹھائے جائیں گے، فرمایا، تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا، تو یہاں سے نکل خوار اور راندہ۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱-۱۸

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی رہو جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکیو کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ پس شیطان نے ان کے اندر وسوسہ اندازی کی کہ عریاں کر دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے خداوند نے تو تمھیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے نہ بن جاؤ۔ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمھارے خیر خواہوں میں ہوں۔ اس طرح اس نے فریب سے ان کو شیشے میں اتار لیا۔ پس جب انھوں نے درخت کا پھل چکھ لیا تو ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہو گئیں اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو آواز دی کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے؟ وہ بولے اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور کھانا ملنا ہے۔ فرمایا، اسی میں تم جیوگے، اسی

ہیں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤگے۔ ۱۹-۲۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۱۰)

ارض سے مراد سرزمین حرم ہے

تمکین فی الارض، سے مراد زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے۔ مثلاً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۲۱- یوسف (اور اسی طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں اختیار و اقتدار بخشا) ارض، اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن خطاب چونکہ قریش سے ہے اس وجہ سے اس سے مراد یہاں سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ معایش، سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں

قریش کا اختیار و اقتدار سرزمین حرم میں

حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان برکتوں اور نعمتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے اور ہم تفصیل کے ساتھ بقرہ میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ۵۷۔ قصص (کیا ہم نے ان کو ایک پرامن حرم میں اقتدار نہیں بخشا جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں) قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ، یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے کہنے ہی کے لیے اوپر والی باتیں بطور تمہید بیان ہوئیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی دعاؤں اور بیت اللہ کے طفیل تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں اختیار و اقتدار کی نعمت بھی بخشی اور معاش و معیشت کی نہایت فراخ راہیں بھی کھولیں لیکن تم سخت ناشکرے نکلے کہ تم نے اپنے پروردگار کے بجائے شیطان کی، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، پیروی کی اور اس نے جن جن فتنوں میں تم کو مبتلا کرنا چاہا ہے تم ان سب میں مبتلا ہو گئے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۱-۱۸)

آدم و ابلیس کا ماجرا اور اس کے مضمرات

اب یہ آدم اور ابلیس کا وہ ماجرا سنایا جا رہا ہے جس سے آدم اور ان کی ذریت کے ساتھ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی دشمنی کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے، اس کا اصل سبب بھی واضح ہوتا ہے اور قیامت

تک کے لیے اس کو باقی رکھنے اور اولادِ آدمؑ سے انتقام لینے کا شیطان نے جو عہد کر رکھا ہے، اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس قصّے کو پڑھتے ہوئے وہ مقصدِ نگاہ سے اوجھل نہ ہو جس کے لیے یہ سنایا گیا ہے۔

شیطان کو آدمؑ اور ان کی ذریت سے دشمنی اس حسد کی بنا پر ہے جو آدمؑ کی تکریم کے حکم سے اس کو لاحق ہوا۔ اس حکم کی تعمیل سے اس نے نہایت تکبر کے ساتھ انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ نہایت ذلت کے ساتھ جنت سے نکالا گیا۔ بالآخر اس نے اس غصہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ اسے اٹھائے جانے کے دن تک کے لیے یہ مہلت دی جائے کہ وہ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنے جوہر آزمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ یہ درخواست منظور ہو جانے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ میں ان کو توحید کی راہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالوں گا اور ان کو اپنی تدبیروں، چالوں اور اپنے پروپیگنڈوں سے اس طرح بدحواس کر دوں گا کہ ان کی اکثریت تیری توحید کی راہ سے ہٹ جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ، جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی، ہرگز کسی فضیلت کا سزاوار نہیں ہے۔

اس کے بین السطور پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آئیں گی۔

ایک یہ کہ شیطان کو اصل کد انسان سے یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس پر ترجیح کیوں دی؟ اس نے اسی ترجیح کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا سے مہلت مانگی ہے۔ اب یہ انسان کی کیسی بدبختی ہے کہ وہ اس معرکے میں، جو خود اسی کے خلاف شیطان نے برپا کیا ہے، شیطان کا دست و بازو بن جائے اور خود اپنے عمل سے شیطان کے حق میں گواہ بن کر یہ ثابت کرا دے کہ خدا نے اس کو جس عزّت کا اہل سمجھا درحقیقت وہ اس کا اہل نہیں تھا بلکہ اس کے باب میں شیطان ہی کا گمان صحیح تھا۔

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں ایک کارزارِ امتحان میں ہے جہاں شیطان سے ہر قدم پر اس کا مقابلہ ہے۔ شیطان اپنے سارے داؤں، سارے فریب، سارے جوہر انسان پر استعمال کرنے کے لیے خدا سے مہلت لے چکا ہے۔ خدا نے اس کو، جہاں تک ورغلانے کا تعلق ہے، مہلت دے دی ہے اور یہ مہلت اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حاصل ہے۔ قیامت کے دن یہ فیصلہ ہو گا کہ کون جیتا اور کون ہارا؟

تیسری یہ کہ شیطان کی اس ساری سعیِ اغوا و اضلال میں اصل ہدف عقیدۂ توحید ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شبخون مارنے کا اس نے الٹی میٹم دیا ہے کہ میں اس راہ سے انسان کو ہٹا کر چھوڑوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔ اوپر قرآن کو قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ کے الفاظ سے اسی امرِ واقعی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ شیطان نے انسان کے بارے میں جو گمان ظاہر کیا تھا تم نے اس کو اپنی نالائقی سے حرف حرف سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس وجہ سے تم خود اسی انجامِ بد کے مستوجب بن چکے ہو جس کی خبر شیطان کے الٹی میٹم کے جواب میں خدا نے سنا دی تھی کہ میں تجھ کو

اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا۔

نظم کلام کے واضح ہو جانے کے بعد الفاظ و اجزائے کلام کی وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان میں سے اکثر چیزیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے زیر بحث آ چکی ہیں۔ ان کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ البتہ جو چیزیں وہاں زیر بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم یہاں کیے دیتے ہیں۔

لفظ 'خلق' کا مفہوم

'وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ الایۃ'۔ 'خلق' کا صحیح لغوی مفہوم، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کا خاکہ (DESIGN) بنانا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اپنے دوسرے لوازم و متعلقات مثلاً 'برء'، 'تسویہ'، 'ترکیب' اور 'تصویر' کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ تنہا استعمال ہُوا ہے وہاں یہ اپنے تمام لوازم و متعلقات پر مشتمل ہے۔ لیکن جہاں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ آیا ہے جیسے یہاں 'خَلَقْنٰكُمْ' کے بعد 'صَوَّرْنٰكُمْ' بھی ہے تو ایسے مواقع میں یہ اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں 'خلق' اور 'تصویر' کے دو لفظوں نے تخلیق کی ابتدائی اور انتہائی دونوں حدیں واضح کر دیں۔ ہر مخلوق کا مرحلۂ ابتدائی تو یہ ہے کہ اس کا خاکہ بنا اور اس کا آخری و تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اس کی صورت گری ہوئی اور اس کے ناک نقشے اور نوک پلک درست ہوئے۔

یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش ہیں، اور بیان ان کے سامنے نوع انسانی کی تخلیق اور ان آزمائشوں کا ہو رہا ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت آدمؑ تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اس وجہ سے ان کی سرگزشت تنہا انہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ پوری نسل انسانی کی سرگزشت ہے۔

شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے

'ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ' سجدہ کے مفہوم، اس حکم کی مصلحت، جنات کے اس حکم میں شامل ہونے کی وجہ اور اس ذیل کے دوسرے اہم مسائل پر ہم بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ 'ابلیس' اس جن کا لقب ہے جس نے باوا آدمؑ کو دھوکا دیا۔ یہ جنات میں سے تھا اور خدا کی نافرمانی کر کے سرکش بن گیا۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں وہ سب اس کی معنوی ذریت ہیں۔ ایسے ہی جنوں اور انسانوں کے لیے قرآن میں شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شیطان، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا، کوئی مستقل بالذات مخلوق نہیں ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

'قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ' قرآن میں، دوسرے مقام میں، یہی بات یوں فرمائی گئی ہے قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۷۵: ص) (فرمایا، اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک جگہ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لا' ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ 'مَا مَنَعَكَ' میں چونکہ خود 'لا' کا مضمون موجود ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کا لانا ضروری نہیں ہے لیکن لائیں تو اس سے شدتِ نکیر کا مضمون پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس فقرے میں شیطان کے عدم سجدہ کی شناعت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان

میں بھی ہے۔

آدم بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے

اِذْ اَمَرْتُكَ کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدم بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے بلکہ خدا کے حکم کی بنا پر اس کے سزاوار ہوئے تھے اور ان کو سجدہ اصلاً و حقیقتہً ان کو سجدہ نہیں تھا، بلکہ خود خدا کو سجدہ تھا اس لیے کہ یہ سجدہ اسی کے امتثال امر میں تھا۔

نسل و نسب کو بنائے شرف سمجھنا ابلیس کی وراثت ہے

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس گھمنڈ پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے۔ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہاں یہ رہنمائی دی کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے ہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

تکبر شرک ہے

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا الآیۃ۔ جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہم سر ٹھہراتا ہے جو صریحاً شرک ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔ جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بہشت صرف خاشعین و عابدین کی جگہ ہے اس وجہ سے ابلیس کو وہاں سے نکلنے کا حکم ہوا اور اس کے تکبر کے جرم میں اس کو دائمی ذلت کی سزا دی گئی۔ آگے اسی طرح کے متکبرین کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح متکبرین خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۴۰ (بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے) بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیحؑ نے فرمائی ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتا۔ دونوں تعبیروں میں صرف یہ فرق ہے کہ قرآن نے اصل جرم استکبار کا حوالہ دیا ہے اور سیدنا مسیحؑ نے علت جرم یعنی دولت کا، جو بالعموم استکبار کا سبب بن جاتی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیطان کا اصل جرم استکبار تھا جس کے سبب سے وہ جنت سے نکالا گیا۔ اس وجہ سے جو لوگ اس جرم میں اس کے ساتھی بنیں گے ان کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی مقام نہیں ہے۔

انسان کے لیے اصل معرکۂ امتحان

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ۔ ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے

نکل جانے کا حکم ہوا اس وجہ سے اس کو گمان ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت باقی نہیں رہی ہے۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ اسے مہلت عطا کی جائے کہ وہ ثابت کر سکے کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دے دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی زندگی کارزارِ امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اپنا پورا زور اس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو نااہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں ٹھہری کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فی الواقع وہ اس کا اہل ہے۔

کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت پر

یہ مہلت سعی و عمل چونکہ انسان کو موت ہی تک حاصل ہے اس وجہ سے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقع صرف انسان کی موت ہی تک ہے۔ مر جانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس پر زور آزمائی کی راہ بھی مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا، قیامت کے دن ہی ہونا ہے اس وجہ سے ابلیس نے مہلت 'اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ' مانگی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و مزیت کے معاملہ کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرا دیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہو گا کہ انسان اس تاجِ زریں کا سزاوار ہے یا نہیں؟ اگر وہ سزاوار ٹھہرا تو اس کے لیے جنت کی ابدی نعمتیں ہیں ورنہ جس طرح شیطان دوزخ میں ہو گا اسی طرح انسان بھی دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے گا۔

ابلیس کا چیلنج اللہ تعالیٰ کو

'قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ' اپنی درخواست منظور کرا لینے کے بعد یہ چیلنج ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو دیا۔ اس نے اپنا اصل حریف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھا اس وجہ سے چیلنج بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دیا۔ گویا اس کارزار میں شیطان کے نقطۂ نظر سے، اصل مقابلہ شیطان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ خدا اور شیطان کے درمیان ہے۔ 'فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ' (بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے معاملہ میں اپنے رویہ کو بالکل صحیح سمجھا۔ اس کے نزدیک اس کی گمراہی خود کردہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) خدا کردہ ہے۔ گویا خدا نے اسے ڈالا ہی تھا ایسے امتحان میں جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے وہ گمراہ ہوا تو اس گمراہی پر نعوذ باللہ خدا ہی نے اس کو مجبور کیا۔

شیطان کی اصل گھات

'صِرَاطَ مُسْتَقِیْمَ' سے مراد توحید کی راہ ہے۔ انسان کی فطرت اور خدا میں براہِ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری پیچ نہ پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس وجہ سے توحید کو قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی 'صِرَاطِ مُسْتَقِیْمَ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک، وہ سست رَو اور آبلہ پا ہو کر بھی رو بمنزل رہتا ہے اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے رو گرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے

اس کا سفر کسی "ضَلٰلِ بَعِیْد" ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اس وقت تک موقع نہیں ملتا جب تک وہ اس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

شیطان کے ہمہ جہت حملے کا بیان

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ۔ یہ بیان ہے شیطان کے حملہ کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، لٹریچر ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا، وہ اس کے تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔ شیطان کا یہی چیلنج سورۂ بنی اسرائیل میں بدیں الفاظ نقل ہوا ہے۔ قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ہ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ہ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ۶۲-۶۵ (ذرا دیکھ تو، یہی ہے وہ جس کو تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے قیامت تک کے لیے مجھے مہلت بخشی تو تھوڑے قلیل کے سوا میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ خدا نے فرمایا، چل دور ہو، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو تمہارا بھرپور بدلہ جہنم ہے۔ تو ان میں سے جن کو اپنے شور و شغب سے اکھاڑ سکے اکھاڑ لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں ساجھی بن جا اور ان کو اپنے پرفریب وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کے سارے وعدے ان سے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں —— بے شک تجھ کو میرے خاص بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے) اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان پر یہ اختیار نہیں بخشا کہ وہ اس کے ارادے اور اختیار کو سلب کر سکے۔ انسان کا ارادہ و اختیار بہرحال باقی رہے گا۔ اس وجہ سے اللہ کے جو بندے صراط مستقیم پر قائم رہنے کا عزم کر لیں گے وہ شیطان کی تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم اس پر قائم رہیں گے، اگرچہ اس کے لیے انھیں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔

توحید کی اصل روح

وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ، کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو ان کی اکثریت کو اپنا موحد نہیں پائے گا۔

اس لیے کہ توحید کی اصل حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنی ہر نعمت کو اللہ ہی کا عطیہ، اسی کا فضل جانتے اور اسی کا شکر گزار رہے۔ اگر وہ اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دے تو شرک ہے۔ اس مسئلہ پر پیچھے بھی بحثیں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اسی سورہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو سامنے آئیں گے۔ اوپر آیت ۱۰ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

خدا کا دوٹوک فیصلہ

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وہ مہلت تو دے دی جو اس نے مانگی لیکن ساتھ ہی اس نے اس کو ذلیل و خوار کر کے جنت سے نکال بھی دیا اس لیے کہ جنت میں متمردین و متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کا انجام بھی واضح فرما دیا جو انسانوں اور جنوں میں سے اس کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جس طنطنہ اور زور کے ساتھ شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے اور ان کی اکثریت کو جیت لینے کے عزم کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی پوری شان بے نیازی اور جبروت کے ساتھ دیا ہے جس سے واضح ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ دوٹوک ہے، اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔

يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ (۱۹ - ۲۵)

سرگزشت آدم و ابلیس کے چند مضمرات

یہ اسی سرگزشت کا آگے کا حصہ بیان ہو رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان کو جنت سے نکالنے کے بعد آدم و حوا کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ تم چین سے جنت میں رہو، اس کی تمام نعمتوں سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، بس اتنا خیال رکھنا کہ فلاں درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم خود اپنی جان پر ظلم ڈھاؤ گے اور اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ شیطان نے یہیں سے آدم پر حملہ کرنے کی راہ نکال لی۔ اس نے آدم و حوا کو یہ پٹی پڑھائی کہ اس باغ میں کوئی درخت فائدہ اٹھانے کا ہے تو وہی ہے جس سے تمھیں تمھارے رب نے روک رکھا ہے۔ اس نے تمھیں محض اس وجہ سے روکا گیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھاری زندگی ابدی نہ ہو جائے۔ شیطان نے قسمیں کھا کھا کے آدم و حوا کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلا دیا۔ بالآخر انھیں اس درخت کا پھل کھا لینے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا پھل چکھتے ہی وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے اور اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر پتے سینے شروع کر دیے۔ اس وقت خدا نے ان کو آواز دی

کہ میں نے تو تمھیں آگاہ کر دیا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ اپنی دشمنی کا کھلے بندوں اعلان کر چکا ہے۔ اس پر آدمؑ وحوا کو تنبہ ہُوا۔ انھوں نے فوراً توبہ واستغفار کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی لیکن ساتھ ہی آدم وحوا اور ابلیس سب کو وہاں سے نکلنے کی ہدایت ہُوئی کہ اب تمھارا مستقر زمین ہے۔ اس میں تم ایک دُوسرے سے آزمائے جاؤ گے، پھر جو اس جنت کا اپنے آپ کو حق دار ثابت کرے گا وہ جنت پائے گا اور جو دوزخ کا سزاوار ٹھہرے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

اس سرگزشت کے سنانے سے جن حقائق کا سراغ مقصود ہے ان پر تفصیل سے سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ جو باتیں وہاں زیر بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم بیان کریں گے۔

یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ الاٰیۃ، 'شجرہ' پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے 'فَکُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ پوری جنت کی ہر چیز سے آدمؑ وحوا کو فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل تھی، صرف ایک درخت سے ان کو روکا گیا تھا لیکن وہی درخت ان کے لیے آزمائش بن گیا۔ شیطان نے اسی شجرِ ممنوعہ کے فوائد وبرکات پر ایسی دلفریب تقریر کی کہ آدمؑ اللہ کے عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ شیطان کی یہی تکنیک اولادِ آدمؑ کے ساتھ اس دنیا میں بھی ہے۔ اس دُنیا کی ہر چیز انسان کے لیے مباح ہے صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جو ممنوع ہیں۔ شیطان بس انہی چیزوں کو لے کر اپنی اور اپنے کارندوں کی وسوسہ اندازیوں سے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ تمھاری ساری کامیابی وترقی کا راز بس انہی چیزوں کے اندر مضمر ہے جن سے روک دیا گیا ہے۔

ابلیس کو جنت سے نکلنے کے بعد بھی آدمؑ تک رسائی حاصل تھی

'فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ لِیُبْدِیَ لَهُمَا الاٰیۃ' ہر چند شیطان مردود قرار پا کر جنت سے نکالا جا چکا تھا لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ اس نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو ورغلانے اور بہکانے کے لیے مہلت حاصل کر لی تھی۔ اس مہلت کے سبب سے معلوم ہوتا ہے، اس کو آدمؑ وحوا تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور وسوسہ اندازی کے لیے آدمؑ کے پاس پہنچ گیا۔

لِیُبْدِیَ لَهُمَا مَاوٗرِیَ عَنْهُمَا میں لؔ عاقبت کا ہے۔ شیطان کی کوشش تو، جیسا کہ اس نے اپنے چیلنج میں ظاہر کیا ہے آدمؑ کو کفرانِ نعمت اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا کرنے کی تھی لیکن اس کا انجام چونکہ اس شکل میں ظاہر ہُوا کہ آدمؑ وحوا حلۂ جنت سے محروم ہوگئے، اس وجہ سے اس کو اس طرح فرمایا گیا ہے گویا شیطان کی کوشش تھی ہی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر۔ حلۂ جنت سے یہ محرومی اشارہ تھی اس بات کی طرف کہ اب آدمؑ کو اپنی ساری ضروریات اپنی سعی ومحنت سے فراہم کرنی ہیں۔ اب تک ان کے لیے ہر چیز کا جو خدا ساز انتظام تھا وہ اس نافرمانی کے بعد ختم ہوگیا۔

آدمؑ کا تصور فرشتوں اور زندگی سے متعلق

'مَا نَهٰکُمَا رَبُّکُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَا مَلَکَیْنِ' ابلیس نے آدمؑ کو لالچ دیا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آجائیں گے یا انھیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدہ سے مشرف ہونے کے باوجود آدمؑ فرشتوں کے مرتبہ کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے

بنرزہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو ان کو حاصل ہوئی ہے ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان ان کو ان دونوں چیزوں کے نام پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔

مفاعلت مبالغہ کے مفہوم کے لیے

'وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ'، 'مقاسمۃ'، باب مفاعلت سے ہے جو عام طور پر تو مشارکت کے مفہوم کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ صرف تکثیر اور مبالغہ کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں 'اقسم' کے بجائے 'قاسم' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شیطان کو اپنا اعتماد جمانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے اسے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، محض بربنائے خیر خواہی کہہ رہا ہے اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔

'فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ'، 'یادلاد الدلو' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'دلی فلانا بغرور' کے معنی 'اوقعہ فیما اراد من تغریرہ' اس نے اس کو جس فریب میں مبتلا کرنا چاہا اس میں مبتلا کر دیا، اس کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا، اس کو شیشہ میں اتار لیا۔

ستر پوشی انسان کی فطرت ہے

'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ'۔ درخت چکھنے کے معنی درخت کا پھل چکھنے کے ہیں۔ عربی میں مضاف کے حذف کر دینے کا اسلوب بہت معروف ہے۔ 'خصف' کے معنی گانٹھنے، گوتھنے، جوڑنے کے ہیں۔ یہ درخت، جیسا کہ اوپر گزرا، آدم پر حرام ٹھہرایا گیا تھا اس وجہ سے اس کا پھل کھا لینے کی سزا ان کو یہ ملی کہ وہ حلّہ جنت سے محروم ہو گئے۔ لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اس وجہ سے صورت واقعہ کی پوری تصویر سامنے لانے کے لیے اس کو 'بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثے سے آدمؑ و حوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گوتھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

'وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا الآیۃ' یہ اشارے ہیں ان تنبیہات کی طرف جو اوپر آیات ۱۹-۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ آدمؑ پر شیطان کی دشمنی کی نوعیت بھی اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی، اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی واضح کر دیا گیا تھا اور خاص اس درخت کی نشان دہی بھی تعین کے ساتھ کر دی گئی تھی جس سے ان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔

'قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا' یہ آدمؑ و حوا کی وہ توبہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تنبیہ کے بعد کی۔ اس توبہ کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ ابلیس کے متعلق تو اوپر گزر چکا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کر کے تنبیہ کے باوجود، اکڑ گیا لیکن آدمؑ و حوا نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا، خدا سے معافی مانگی اور بقرہ میں تصریح گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان پر رحم فرمایا اور اس طرح آدمؑ نے اپنے عمل سے اپنی ذریت کے لیے مثال قائم کی کہ اگر شیطان کے ورغلانے سے انسان کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کے نتائج سے بچنے کی راہ توبہ ہے۔

توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی

'قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ الایۃ' اس آیت کے تمام پہلوؤں پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے آدمؑ و حوا نے اگرچہ توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ اللہ تعالیٰ نے منظور بھی فرمائی تاہم حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ آدمؑ و حوا جنت سے نکلیں اور اس دنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں، پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہی رہا جس کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا لیکن میدان مقابلہ جنت کے بجائے یہ دُنیا بنا دی گئی اور جنت کو انعام قرار دے دیا گیا، اولادِ آدم میں سے ان خوش بختوں کے لیے جو شیطان کے مقابل میں سُرخ رُو ٹھہریں۔

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' کے ٹکڑے پر تفصیل سے تفسیر بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اسلوب کلام دلیل ہے کہ اس میدان میں آدمؑ و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریقوں کی حیثیت سے گیا ہے۔ شیطان کو یہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ اولادِ آدم میں سے جن کو جیت سکتا ہے جیت لے اور اولادِ آدم کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ جو جنت کی میراث حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ شیطان کو پچھاڑیں اور جنت جیت لیں۔

آدمؑ اور ابلیس دو محارب فریق

یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاریٰ کو پیش آیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے۔ قرآن نے بقرہ میں بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدمؑ توبہ کے بعد اپنی پچھلی غلطی کے خمیازے سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لیے ہوا کہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم و ایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی۔

نصاریٰ کا مغالطہ

'قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ الایۃ' یہ ان مراحل کا بیان ہے جن سے اس دنیا میں آدمؑ و اولادِ آدم کو گزرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان تمام مراحل سے گزر کر تم ہمارے پاس لوٹو گے اور اس وقت ہم تمھیں بتائیں گے کہ تم نے کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے اور اس میدانِ مقابلہ سے تم سرخرو ہو کر لوٹتے ہو یا نامراد ہو کر۔

آدمؑ و اولادِ آدم کے لیے عمل و امتحان کے مراحل

۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۶-۴۳

آگے کی آیات میں پہلے ان باتوں کی یاد دہانی کی گئی ہے جن سے، شیطان کی دشمنی کے پیش نظر، اولادِ آدمؑ کو شروع ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا اور جن کا اہتمام پیش آنے والے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے ہر ابن آدمؑ کا فرض تھا تاکہ وہ اس افتاد سے محفوظ رہیں جو ان کے دشمن ازلی کے ہاتھوں ان کے باپ کو پیش آئی۔

اس کے بعد قریش کی طرف، جو اس سورہ میں مخاطب ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے ہیں جس طرح ان کے ماں باپ ـــ آدمؑ و حوّا ـــ کے اتروا لیے تھے لیکن یہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے حیائی انھوں نے شیطان کی پیروی میں نہیں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اختیار کی ہے اور دلیل اس کی ان کے پاس صرف یہ ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں پایا ہے۔

اس کے بعد اس روح اور اصل الاصول کا حوالہ دیا جو تمام خدائی احکام میں لازماً ملحوظ ہے اور جو خدائی احکام اور شیطانی بدعات میں امتیاز کے لیے عقلی و فطری کسوٹی ہے۔ پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ آج جن ابلیسی بدعات کو قریش خدا کا دین بتا رہے ہیں ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ باتیں انھوں نے شیطان کی رہنمائی میں خود ایجاد کی ہیں اور منسوب ان کو خدا کی طرف کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی دی کہ انھوں نے یہ روش نہ بدلی تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے ان کی ہم مشرب قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کا حوالہ دیا جو آدمؑ کو اس رزم گاہ امتحان میں اتارتے وقت ان کی ذرّیت میں انبیاء و رسل کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کرنے کے لیے فرمایا تھا اور یہ آگاہی دی تھی کہ جو ان انبیا کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے امان میں رہیں گے اور جو ان کو جھٹلائیں گے وہ اپنی مہلت حیات پوری کر کے دوزخ میں پڑیں گے۔

اس کے بعد مکذبین انبیا اور متبعین انبیا دونوں گروہوں کے احوال آخرت کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ پہلے گروہ کے متعلق بتایا ہے کہ جب دوزخ میں سب اگلے پچھلے اکٹھے ہوں گے تو آپس میں جوتیوں میں دال بٹے گی اور ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔ اخلاف جن بڑوں کی پیروی پر آج نازاں ہیں، کل ان کو گالیاں دیں گے کہ انھوں نے ہماری راہ ماری، یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ اکابر اخلاف کو گالیاں دیں گے کہ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی، اس میں ہمارا کیا قصور۔ دوسرے گروہ کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ جنت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے خوش خوش

بیٹھے ہوں گے، کسی نفرت و ملامت کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا، مبارک سلامت کے تحائف کے مبادلے ہو رہے ہوں گے اور ہر گوشے میں خدا کے ترانۂ حمد اور انبیاء کے احسانات کے اعتراف سے محفل گونج رہی ہوگی ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶-۴۳

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع ۳/۱۰ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ
نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ
قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا
وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾ قَالَ ادْخُلُوْا
فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا
قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا

ع

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

الثلثة

ترجمہ آیات ۲۶-۴۳

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے لیے ستر پوش بھی ہے اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اے بنی آدم! شیطان تمھیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے، جس طرح اس نے تمھارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا اُن کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے، وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔ ۲۶-۲۷

اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں، کہتے ہیں، ہم نے تو اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو، اللہ کبھی

بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔ کہہ دو، کہ اللہ نے تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیا ہے۔ اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رُخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے جس طرح اس نے تمہارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے ہدایت بخشی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ انھوں نے اللہ کے ماسوا شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ کہہ دو، میرے رب نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ۔ اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کا کسی چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر کسی ایسی بات کا بہتان لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے تو جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۲۸-۳۴

اے بنی آدم! اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھیں یا اس کی آیات کو جھٹلائیں۔ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کو قبض کرنے آئیں گے تو اُن سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ لاریب وہ کفر میں رہے۔ حکم ہوگا، جاؤ، پڑو دوزخ میں ان امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ جب جب کوئی امت داخل ہو گی اپنی ساتھی امت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے، ان کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا تو ان کو دہرا عذاب نار دیجیو۔ ارشاد ہوگا تم سب کے لیے دہرا ہے، پر تم جانتے نہیں۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو بھی تو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی تو تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو۔ ۳۵-۳۹

بے شک جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں نہیں داخل ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ سما جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہو گا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے —— ہم کسی جان

پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے —— وہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم کھینچ لیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اس چیز کی ہم کو ہدایت بخشی، اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے۔ اور ان کو پیغام دیا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث ٹھہرائے گئے ہو۔ ۴۰-۴۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۶-۲۷)

لباس سے سترپوشی اور زینت دونوں چیزیں مقصود ہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا۔ 'ریش' کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے۔ لباس کا اولین مقصد تو سترپوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ قدرت نے جو چیز بھی بنائی ہے اس میں مختلف پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ سترپوشی کے لیے تو بھگوا یا لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن قدرت نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو سترپوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار، ہمارے حسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ افراط یا تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن نے زینت کو مقاصدِ لباس میں داخل کر کے اس جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔

باطنی لباس تقویٰ ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ یعنی ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا

ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے جو اس ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے کہ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار کرتا ہی ہے اپنے اسی باطنی لباس کی تحریک سے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے اور اس کے لباس سے اس کے وقار میں اضافہ ہونے کے بجائے یا تو اس کی رعونت میں اضافہ ہوتا ہے یا اس کی بدقواری گی ہیں۔ یہ لباس تقویٰ، حیا، خشیتِ الٰہی، اور احساس عبدیت سے بنتا ہے اور جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل وقار و جمال اسی کا ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے، جو بھی اس کو دیکھتا ہے بے تحاشا مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ پکار اٹھتا ہے۔

ان باتوں کی یاددہانی جن کی ہدایت ابتدا ہی میں آدم کو کی گئی تھی

'ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یہ اوپر والی بات جس کی یاددہانی کی گئی ہے ان باتوں میں سے ہے جن کی ہدایت اولادِ آدم کو اسی وقت کر دی گئی تھی جب آدم کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اور مقصود اس کے حوالہ سے یہ ہے کہ قریش متنبہ ہوں کہ شیطان نے جس فتنے میں آدم کو مبتلا کیا اسی طرح کے فتنے میں اس نے انھیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدم کو اس دنیا میں بساتے وقت آدمؑ اور اولادِ آدم کو جو ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھیں ان میں سے بعض کا حوالہ قرآن نے دیا ہے۔ مثلاً بقرہ میں ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸ (ہم نے کہا یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمھارے پاس میری کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم) بعینہٖ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں آیت ۳۵ میں آ رہا ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (اے بنی آدم اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تمھیں میری آیات سناتے ہوئے تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کی، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ ان کو غم لاحق ہوگا) ہمارے نزدیک یہاں بھی انھی باتوں کا حوالہ ہے جن کی ہدایت ابتداہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھی تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو شیطان کے اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکیں جس قسم کے فتنے میں اس نے آدمؑ و حوا کو ڈال دیا۔ یہ انھی باتوں کی یاددہانی اب قریش کو کی جا رہی ہے تاکہ انھیں خبردار کیا جائے کہ وہ بھی شیطان کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں اور اس نے وہی داؤں ان پر بھی چلایا ہے جو آدم پر چلایا تھا۔

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت پر بھی یہاں نظر رہے۔ باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی سرگزشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابلِ فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اس کو منتقل کرتے اور برابر

منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہرحال پشتہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا اگرچہ اس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ان کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اس دشمن اور اس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیر خواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے انہی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اس نے آدمؑ کو گرانا چاہا تھا اور وہ اس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے ان کو بچا یا نہ ہوتا — قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جائیے کہ صرف 'یا بنی آدم' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں۔ آدمؑ کا جو غیرت دار و وفادار بیٹا اس خطاب کے ساتھ قرآن کی ان یاد دہانیوں کو سنتا ہے اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوشِ حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اس خطاب کے بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال

'یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا' بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انہی یاد دہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھیں۔ اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخر ان کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ و خشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے، گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا

کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عُریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مرجاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہوجاتا ہے۔ پھر یہ بے حیا معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کر کے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں۔

شیطان کے گنت بھیس ان اور اس کے چرترب شما ہیں

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ یہ شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی، وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمہارے لیے وہ وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انھیں دوست، ناصح، خیر سگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمہارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمہارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمہارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے —— مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکنے رہنا۔

شیطان کے فتنوں سے واحد امان

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ شیطان اور اس کے جتھے کے حملوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتائی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے جمے رہنا۔ ایمان سے مراد اللہ اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس دنیا میں اتارتے وقت شیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ بتائی تھی کہ جو میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، "قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸۔ بقرہ (ہم نے کہا کہ یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم) زیر بحث ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرے جما لیتے ہیں، خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں ان کے اندر شیاطین کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی بات دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوئی ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶۔ زخرف (اور جو خدائے رحمان کی یاد سے بے پروا ہوجاتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا

ساتھی بن جاتا ہے)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ۝ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ (۲۸-۳۰)

قریش پر شیطان کا جال

ان یاددہانیوں کو سنانے کے بعد جو اولادِ آدم کو کی گئی تھیں اب یہ قریش اور عربوں کا حال سنایا جا رہا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کو چکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور وہ اس کو اپنا دوست بنائے بیٹھے ہیں حالانکہ اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا ہے جس طرح کا معاملہ ان کے باپ ماں — آدمؑ و حوا کے ساتھ کیا تھا۔ آدم و حوا کے کپڑے اس نے جنت میں اتروا لیے تھے، آدم کے ان بیٹوں اور حوا کی ان بیٹیوں کے کپڑے اس نے حرمِ الٰہی میں اتروا لیے ہیں اور ستم یہ ہے کہ یہ اس کو اپنے باپ دادا کی روایت اور خدا کی ہدایت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خدا کی ہدایت نہیں بلکہ شیطان کا فتنہ ہے اور اس طرح اس نے یہ چاہا ہے کہ جس طرح اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اسی طرح ان کو ننگا کر کے اس حرمِ پاک سے بے دخل کرائے[1]۔

طوافِ عریاں کا فلسفہ اور اس کے مہلک اثرات

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۔ فاحشۃ اس کھلی ہوئی بے حیائی کو کہتے ہیں جس کو اندھوں اور احمقوں کے سوا سب بے حیائی قرار دیں۔ ہمارے مفسرین نے یہاں اس سے وہ بدعت مراد لی ہے جو خانہ کعبہ کا ننگے ہو کر طواف کرنے کی عرب جاہلیت میں رواج پا گئی تھی۔ مفسرین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عرب جاہلیت کی بے حیائیوں میں سے یہی بے حیائی ہے جس کو وہ، جیسا کہ وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا کے الفاظ سے واضح ہے، حکمِ شریعت کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے، مرد ہوں یا عورتیں، انھوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش میں سے کسی سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائشِ دنیا اور زینتِ دنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگ جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک مکروہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مندروں اور کلیساؤں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور جو تمام تر ان کے پروہتوں اور پجاریوں کی شیطنت سے وجود میں آئیں لیکن ان کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ مزارات کے مجاوروں نے بھی اس معاملے میں شیطان کا بہت ہاتھ بٹایا ہے۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار

---

[1] یہ حقیقت یہاں پیش نظر ہے کہ بیت اللہ، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب تفسیر سورۂ کوثر میں تفصیل سے ثابت کیا ہے، اس دنیا میں حوضِ کوثر کا مجاز ہے۔

کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن گئی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہوئیں جن کو پڑھیے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا، کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ ہے اس حقیقت کا ایک پہلو جو اوپر اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ میں بیان ہوئی ہے۔

خدا کے احکام کی شناخت کے لیے کسوٹی

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ تردید ہے اوپر والی بات کی کہ تم اس بے حیائی اور بے شرمی کو خدا کا حکم قرار دیتے ہو، خدا کبھی بے حیائی و بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ پھر جب اس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ بدو شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ حکم کس طرح دے سکتا ہے کہ وہ عین اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جائے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگائے! آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات، انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے؟ خدا پر ایسی بے ہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟ 'مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یعنی ایسی بات جو بالکل بے سند اور بے دلیل ہے۔

'قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ' لفظ 'قسط' پر پوری تفصیل کے ساتھ، ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ قَآئِمٌۢ بِالْقِسْطِ ہے اس وجہ سے بندوں کو اس نے جو حکم بھی دیا ہے سراسر قسط پر مبنی ہے۔ 'قسط' ایک جامع حقیقت ہے جو تمام شریعت الٰہی کی روح ہے۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطۂ عدل و اعتدال کا اہتمام۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے، عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، اخلاق میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، سیاست میں، غرض ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعت الٰہی مبنی ہے۔ موقع و محل کی تبدیلی سے اس کی تعبیریں بدل بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ مثلاً دیکھیے اسی قسط پر یہاں اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ کو مبنی کیا اس لیے کہ جب خالق و مالک خدا ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدے سے آلودہ ہو، اسی پر كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ کو مبنی کیا اس لیے کہ یہ قسط کا تقاضا ہے کہ جب اس نے پیدا کیا، پرورش کے اسباب و وسائل فراہم کیے، خیر و شر کا امتیاز بخشا تو وہ حساب و کتاب بھی کرے اور جزا و سزا بھی دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ قسط نہیں بلکہ ظلم وجود ہو گا۔ پھر دیکھیے آگے چل کر اسی پر خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کو مبنی کیا۔ یعنی یہ بات قسط کے خلاف ہے کہ خدا کی عبادت کے لیے آدمی لباس کو ترک کر دے یا کھانے پینے کی لذات سے دستبردار ہو جائے۔

قسط یہ ہے کہ آدمی پہنے بھی، کھائے پیے بھی، البتہ کسی چیز میں اسراف نہ کرے، اسراف قسط کے خلاف ہے۔ الغرض یہ قسط ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جو شخص حکمت دین سے آشنا ہو وہ اس پر پرکھ کے جان سکتا ہے کہ کون سی بات خدا کی ہے اور کون سی بات خدا کی نہیں ہے۔

مسجد اپنی فطرت ہی سے خدا کے لیے خاص ہوتی ہے

'وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ' 'قسط' ایک حقیقت جامعہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اور اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف خدا کا حق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجد بن سکتی ہے نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رخ کرنے کی نیت کی جا سکتی ہے۔ سجدہ خدا ہی کے لیے زیبا ہے اس وجہ سے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے 'وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا' (جن: اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں تو تم ان میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو) بعینہٖ یہی بات آیت زیر بحث میں فرمائی کہ ہر مسجد صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے، اس وجہ سے اپنے رخ اسی کی طرف کرو۔ 'اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ' کے بعد 'اِلَى اللّٰهِ وَحْدَهٗ' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ بعد کے الفاظ 'وَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ' کے الفاظ اس محذوف کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور اس حقیقت کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ خدا کی عبادت صرف عبادت ہی کے اخلاص کی مقتضی نہیں ہے بلکہ وہ اطاعت کے اخلاص کو بھی مقتضی ہے۔

دریا بکوزہ

'كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ' یہ توحید کے مضمون کی تاکید و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی اطاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور جس طرح اس دنیا میں تنہا آئے ہو اسی طرح تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے بھی، تمہارے مزعومہ شریکوں اور سفارشیوں میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ قرآن کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان فرما دی۔

'فَرِیْقًا هَدٰى وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ' الآیہ مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور اللہ نے ایک گروہ کو اس حقیقت پر ایمان لانے کی توفیق بھی دی ہے لیکن ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو انہی گمراہیوں میں پھنسائے ہوئے ہیں جن میں ابلیس نے ان کو پھنسانے کی دھمکی دی تھی لیکن اپنی شامت اعمال سے گمان یہ کیے بیٹھے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اس جہالت سے باز نہ آئے تو لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ایسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ

الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۱-۳۴)

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ الایۃ' 'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کا خطاب قریش اور عربوں ہی سے ہے۔ اس میں آدمؑ کی طرف نسبت میں بلاغت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس سے آدمؑ و شیطان کی اس سرگزشت کی یاددہانی ہوتی ہے جو تمام نسل آدمؑ کی مشترک سرگزشت ہے اور جو ہر ابن آدم کو یہ سبق دیتی ہے کہ شیطان ان کا ابدی دشمن ہے جس کو دوست بنانا اور جس کے کہے پر چلنا اپنے اور اپنے باپ کے دشمن کو دوست بنانا ہے۔

اس جوگ کی نفی جو عریانی کو تقویٰ ٹھہراتے

'خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ' میں زینت سے مراد لباس فاخرہ نہیں بلکہ مجرد لباس ہے۔ لباس کو زینت کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہاں یہ ہے کہ طواف میں عریانی اختیار کرنے کا فلسفہ یہی تراشا گیا تھا کہ لباس زیب و زینت میں داخل ہے اور زیب و زینت اس عبادت کے شایان شان نہیں ہے۔ حج اور احرام میں فی الجملہ زہد و درویشی تو حضرت ابراہیمؑ کے عہد ہی سے چلی آرہی ہے اور یہ حج کی خصوصیات میں سے ہے لیکن عربوں نے دور جاہلیت میں جہاں اور بہت سی بدعات ایجاد کیں وہیں یہ بدعت بھی ایجاد کر ڈالی کہ احرام کی سادگی اور درویشی کو عورتوں اور مردوں سب کے لیے عریانی کے حد تک پہنچا دیا۔ قرآن نے یہ اسی بدعت کی اصلاح کی۔ فرمایا کہ یہ عریانی بے حیائی ہے۔ اپنے لباس ہر مسجد کی حاضری کے وقت پہنو۔ جس طرح کوئی مسجد غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی مسجد ایسی نہیں ہو سکتی جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ٹھہرا لی جائے کہ آدمی وہاں کپڑے اتار کر حاضر ہو۔ 'كُلِّ مَسْجِدٍ' فرما کر اس حکم کو عام کر دیا کہ حرم اور غیر حرم کی تخصیص نہ رہ جائے۔ یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ٹھہراتی ہے۔

افراط اور تفریط دونوں تقویٰ کے خلاف ہیں

'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ' جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس 'قِسط' کے خلاف ہے جو تمام شریعت اور تمام احکام الٰہی کی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا روح ہے۔ اللہ تعالیٰ 'قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ' ہے اس وجہ سے وہ 'مُقْسِطِيْنَ' یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مُسْرِفِيْنَ' یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں، نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی

کو مقصود بنا لے اور رات دن اسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں کو لا ہو اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں، خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔

اصل نقطۂ اعتدال

یہ سوال کہ ان چیزوں میں نقطۂ عدل و اعتدال کیا ہے اور حدِ اسراف کیا ہے انسان کی عقل سلیم اور فطرت سلیم پر چھوڑا گیا ہے اس لیے کہ اس کی کوئی قانونی حد بندی ممکن نہیں ہے۔ اشخاص اور حالات کے اعتبار سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ ایک غنی اور ایک فقیر دونوں کے لیے کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم ہر غنی سے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے اس میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں اس وجہ سے اس کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا تو مباح ہے لیکن اسراف و تبذیر جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مسرفین کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کے الفاظ معمولی نہیں ہیں اس لیے کہ خدا جن کو دوست نہیں رکھتا لازماً وہ اس کے نزدیک مبغوض ہیں۔

خدا کی نعمتوں پر کوئی پابندی خدا ہی عائد کر سکتا ہے

'قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ' یہ سوال تردید اور انکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عطا کیے ہوئے لباس اور پاکیزہ رزق کو تم نے کس کے کہنے سے حرام ٹھہرایا ہے؟ ان چیزوں کا عطا کرنے والا تو خدا ہے تو ان کو حرام ٹھہرانے کا حق کسی دوسرے کو کہاں سے حاصل ہوا؟ 'الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ' یہاں بطور دلیل وارد ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو خود زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ عطا کرنے والے نے یہ بندوں کے برتنے کے لیے عطا فرمائی ہیں تو ان پر کوئی ناروا پابندی عاید کرنے کے کیا معنی؟ ان پر کوئی پابندی تو ان کا عطا کرنے والا ہی عاید کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمھارے پاس کوئی سند یا دلیل ہو۔

اللہ کی نعمتوں کے جائز حقدار اہل ایمان ہی ہیں

'قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ الاٰية' اس ٹکڑے میں حذف کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں وضاحت کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ متقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف پر دلیل ہو جاتا ہے۔ یہاں 'لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' اور 'خَالِصَةً' کے متقابل الفاظ حذف ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں اس دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان ہی کا حق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں کافروں کو بھی شریک کر دیا ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو وہاں یہ سو فی صدی اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہوں گی، کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہو گا، البتہ دنیا میں انھوں نے ان سے جو فائدہ اٹھایا اس کی جواب دہی انھیں کرنی ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ایمان اور دینداری کے منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقرب الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں یہ ان کا خیال صحیح نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو، اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور اللہ اور

اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔

'کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ' بطور امتنان اور 'لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

خدا کی حرام ٹھہرائی ہوئی اصل چیزیں

'قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ الایۃ' اب یہ بتایا کہ خدا نے حرام کیا چیزیں قرار دی ہیں اور ان کے بتانے کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں وہ تو تم نے نہ صرف جائز بلکہ دین بنا رکھی ہیں اور اچھی بھلی جائز و طیب چیزوں کو حرام کر کے دینداری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہو۔

ان حرام چیزوں میں 'فواحش' ہیں، عام اس سے کہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ ظاہری اور باطنی کی وضاحت انعام آیت ۱۵۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اثم و بغی ہے۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق بھی پیچھے گزر چکی ہے۔ 'بغی' کے معنی تعدی اور سرکشی کے ہیں یعنی خدا کے حدود و احکام سے تعدی و سرکشی۔ اس کے ساتھ 'بِغَیْرِ الْحَقِّ' کی قید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی 'بغی' حق بھی ہوتی ہے بلکہ یہ 'بغی' کے گھنونے پن کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر 'بغی' بجائے خود ناحق ہوتی ہے۔ یہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خدا سے اکڑے اور اس کے حدود پر حملہ آور ہو۔ جس طرح قتل انبیا کے جرم کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

'وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا' یعنی جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے، رہی یہ بات کہ خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل بھی ایسی جو بُرہان یعنی ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہو اس لیے کہ خدا کی خدائی میں یوں ہی کسی کو جوڑ دینا سارے نظام عقل و فطرت اور پورے نظام عدل و قسط کو درہم برہم کر دینا ہے۔ اتنی بڑی بات بغیر اس کے مان لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ خدا نے اس کی کوئی نقلی یا عقلی یا فطری دلیل اتاری ہو۔

'وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' 'تقول علی اللہ' سے مراد 'افتروا علی اللہ' ہے یعنی اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا، من مانے طور پر شریعت تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے۔ اس ٹکڑے سے نبوت و رسالت کی ضرورت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ جب خدا کی طرف کوئی بات بے سند منسوب کرنا ناجائز ہے تو لازم ہے کہ اس کی طرف سے رسول آئیں اور ان کی پیروی کی جائے۔

فرد قرار داد جرم کے بعد انذار

'وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ الایۃ' ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں عرض کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ سورہ انذار کی سورہ ہے۔ یہ باتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض فرد جرم یا اتمام حجت کی نوعیت کی ہیں۔ اس وجہ سے کلام بار بار اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ اوپر آیت ۲۹ میں 'كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ' میں جس طرح آخرت کی یاد دہانی

کی اسی طرح یہ آیت قریش کو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو یاد دلا رہی ہے کہ تمھاری ان تمام شرارتوں کے باوجود اگر تمھاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ پکڑ ہوگی ہی نہیں۔ یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں، جیساکہ آیت ۹۴ میں بیان ہوئی، پوری ہوئی تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمھیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر امت کی تباہی کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جب وہ پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوگی نہ آگے بڑھے گی۔

افراد اور اقوام کے لیے اجل کے الگ الگ پیمانے

یہاں اس مقررہ مدت کے لیے 'اَجَل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افراد اور اقوام کے مقابلے میں خدا نے 'اَجَل' کے پیمانے الگ الگ رکھے ہیں۔ افراد کے پیمانے تو سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں منٹوں کے حساب سے پورے ہوتے ہیں، جب وہ پورے ہو جاتے ہیں، فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی و اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ اخلاقی زوال و فساد کی ایک خاص حد ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے، اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، اسی طرح قوموں اور ملتوں کے فنا ہونے کے صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، وہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے زوال اخلاق کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس کا صفحۂ ارض پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔ یہاں وہ سنت الٰہی یاد رکھنی چاہیے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں کہ کسی قوم میں رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی آخری شکل ہوتی ہے اس وجہ سے قوم جب اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو لازماً فنا کر دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ یونس کی تفسیر میں آئے گی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۳۵-۳۷)

شیطان کے فتنوں سے امان رسول کی پیروی میں ہے

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' یہ اس وعدے کی یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے اس وقت فرمایا تھا جب آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ پیش آیا ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸۔ بقرہ (ہم نے کہا، یہاں سے اترو تم سب تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی اندیشہ طاری ہوگا، نہ ان کو کسی بات کا غم ہوگا)

آدمؑ اور اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ ان کو شیطان اور اس کی ذریات کی فتنہ انگیزیوں سے بچانے کے لیے فرمایا تھا کہ اگر شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنا ہے تو میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرنا۔ آدمؑ و ابلیس کی جو سرگزشت اس سورہ میں اوپر بیان ہوئی ہے اس پر غور کیجیے تو اس کے اندر اس انتظام کی عقلی و فطری ضرورت موجود ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت آدم کے باب میں فرشتوں کے گمان کی تردید بھی اولاد آدم میں پیدا ہونے والے انبیاء و مصلحین کے ناموں کے حوالہ ہی سے فرمائی تھی۔ یہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نسل آدم میں انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری کر کے پورا فرمایا۔ اسی کی یاد دہانی یہاں قریش کو کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں شیطان نے بالکل اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ اس کے فتنوں سے امان کی شکل وہی ہے جو شروع ہی میں بتا دی گئی تھی کہ جو رسولوں کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہیں گے تو تم اگر شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اس رسول کی پیروی کرو جو تمھیں اللہ کی آیات سناتا ہوا آگیا ہے۔

کفار کے انجام کا بیان

'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ' استکبار کے بعد حرف 'عَنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ استکبار یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیات الٰہی سناتے آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے منہ موڑیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔

'فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ الاية' اوپر کی آیات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یاد دہانی ہے۔ اب یہ براہ راست قریش کی نسبت ارشاد ہو رہا ہے کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور بدقسمت کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اس کی آیات کی تکذیب کریں 'اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ' اس دنیا میں زندگی کے جو دن نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں وہ یہ پورے کریں گے یہاں تک کہ ہمارے فرشتے ان کو موت دیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ کہاں گئے، اب ان کو پکارو۔ یہ اس 'اِفْتِرَاء عَلَى اللّٰهِ' کی وضاحت ہو گئی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ شرک کو 'اِفْتِرَاء عَلَى اللّٰهِ' کہنے کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔ فرشتوں کے لیے 'رُسُل' کا لفظ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات میں آیا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'رسول' اور 'ملک' کے لغوی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہاں 'رُسُل' کا لفظ جمع لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ ملک الموت اور ان کے تمام عملہ پر حاوی ہے 'قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا' یہ ان کے اعتراف کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دے دیں گے۔ کسی اور کی گواہی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ (۳۸ - ۴۰)

'قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ' یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آئے گا۔ 'قَالَ' کا فاعل جب اس طرح کے مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے تو یہ بے اعتنائی اور بے رخی پر دلیل ہوتا ہے۔

یہاں دو ظرف مذکور ہوئے ہیں 'فِيْٓ اُمَمٍ' اور 'فِي النَّارِ'۔ پہلے سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ تمہارے ساتھی کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا، جاؤ، ان لوگوں کے شریک حال بنو جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے شیطان کی پیروی کر کے گمراہ ہوئے، دوسرے سے مستقر و مقام کا پتا دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ گویا ساتھی بھی بدترین، جگہ بھی بدترین!

'كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا' الآیۃ۔ 'اِدَّارَكُوْا' اصل میں 'تَدَارَكُوْا' ہے۔ عربی میں الفاظ کی ہیئت میں بعض اوقات اس طرح کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ 'تَدَارَكَ الْقَوْمُ' 'تلاحقوا ای لحق اُخْرٰىهُمْ اُوْلٰىهُمْ' (تدارك القوم کے معنی ہیں قوم کے پچھلے اگلوں سے جا ملے) 'قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ' میں 'لِ'، 'فِي' کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یعنی پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے۔

'ضِعْف' کے معنی دوگنے کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے زیادہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اہل دوزخ کی باہمی جوتی پیزار کی تصویر

یہ تصویر ہے اس جوتی پیزار کی جو ان لوگوں کے اندر دوزخ کے باڑے میں اکٹھے ہو جانے کے بعد ہوگی۔ دنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے، ایک دوسرے کے گن گاتے اور جھنڈے اٹھائے پھرتے رہے، سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے رہے، لیکن وہاں دوزخ میں آمنے سامنے ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائے گا۔ تابعین متبوعین سے کہیں گے تم پر پھٹکار ہو، تمہیں نے ہمارا بیڑا غرق کیا! متبوعین کہیں گے تم خود شامت زدہ تھے کہ تم ہماری راہ چلے، اس میں ہمارا کیا قصور!

یہ صورت حال تو اس وقت کی بیان ہوئی ہے جب بالکل اول اول آمنے سامنے ہوں گے۔ اس کے بعد جب سب اکٹھے ہو لیں گے تو پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں خدا سے استغاثہ کریں گے کہ خداوندا ہم انہی کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اس وجہ سے تو ان کو دونا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا 'لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ' تم میں سے ہر ایک کے لیے یعنی اگلوں اور پچھلوں دونوں ہی کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے

کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہی اصول اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں حضورؐ نے کوئی اچھی یا بری مثال قائم کرنے والوں کے نتائج اعمال کی وسعت و زیادت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں جو قتل بھی ہوتا ہے اس کے وبال کا ایک حصہ آدم کے بیٹے قابیل کے کھاتے میں جمع ہو رہا ہے جس نے ہابیل کو قتل کر کے قتل ناحق کی طرح ڈالی۔ یہاں زیر بحث ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم میں سے اگلے اور پچھلے دونوں ہی کے لیے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں میں سے بھی حصہ ملنے والا ہے جن کے لیے تم نے ان گناہوں کی مثال قائم کی۔ تم فریاد کر رہے ہو کہ تمھارے اگلوں نے تمھارے لیے بری مثال قائم کی اس وجہ سے ان کو زیادہ عذاب ہو۔ ان کو بے شک زیادہ عذاب ملے گا لیکن آخر تم نے جو بری مثال قائم کی یا اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑی اس کے نتائج سے کس طرح بچ جاؤ گے؟ جو پیمانہ ان کے لیے ہے وہی پیمانہ تمھارے لیے ہے۔ اگر ان کی روش بد کے ساتھ ساتھ تم اپنی روش بد کے اثرات کا بھی علم اور اندازہ رکھتے تو تم مانتے کہ تم اور وہ دونوں یکساں مجرم ہو لیکن تمھیں اپنے بوئے ہوئے تخم فساد کی لہلہاتی فصل کی ہولناکیوں کا صحیح تخمینہ معلوم نہیں ہے۔ اب وہ تمھارے سامنے آئے گا۔

جیسے ہم ویسے تم

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ الآیۃ یہ اگلوں کی طرف سے پچھلوں کی مذکورہ بالا بات کا جواب ہوگا کہ اگر ہم نے تمھارے لیے بری مثال قائم کی تو تم نے دوسروں کے لیے کون سی اچھی مثال قائم کی۔ بات تو جب تھی کہ تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ اس صورت میں بے شک تم ہمارے مقابل میں ترجیح اور فضیلت کے سزاوار تھے لیکن جب تم بھی وہی کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو ہم میں اور تم میں فرق کیا؟ جس طرح ہم اپنے کیے کا مزا چکھیں گے تم بھی اپنے کیے کا مزا چکھو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا الآیۃ لفظ استکبار کے ساتھ 'عن' کے صلہ کا فائدہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ الآیۃ کے دو مفہوم

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لیے سماء جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، دوسرا یہ کہ اہل ایمان کی طرح آسمان میں ان کا خیر مقدم نہیں ہوگا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے لے جائے جائیں گے۔ قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں، پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے ان کے خیر مقدم کرنے والے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں، وہ اہلاً و سہلاً، احسنت اور مرحبا، سلام اور تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کی تذلیل مد نظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ گویا لَا تُفَتَّحُ

سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلامِ عرب میں بہت ملتی ہیں۔

متکبر جنت میں نہیں داخل ہو سکتا

'لَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ' یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ انجیل میں ہے "اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" متی ۱۹: ۲۳-۲۴۔ قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا۔ اوپر ہم آدم و ابلیس کے قصے میں استکبار کی حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہوا اس وجہ سے جن کے اندر استکبار کا کوئی شائبہ ہوگا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ سیدنا مسیح کا ارشاد ہے۔ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔

'لَھُمۡ مِّنۡ جَھَنَّمَ مِھَادٌ وَّمِنۡ فَوۡقِھِمۡ غَوَاشٍ' مِھَاد کے معنی بچھونے کے ہیں اور غواش 'غاشیۃ' کی جمع ہے جس کے معنی ڈھانک لینے والی کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اوڑھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَاۤ ۫ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ ۝ وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِھِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھِمُ الۡاَنۡھٰرُ ۚ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ھَدٰىنَا لِھٰذَا ۟ وَمَا کُنَّا لِنَھۡتَدِیَ لَوۡلَاۤ اَنۡ ھَدٰىنَا اللّٰہُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَنُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡھَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۴۲-۴۳)

اہل ایمان کا حال جنت میں

'وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا الایۃ' اب یہ تقابل کے اصول پر اہل ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے کہ وہ جنت میں کس طرح خوش و خرم، ایک دوسرے سے راضی و مطمئن اور اللہ کی توفیق ہدایت اور رسولوں کی رہنمائی پر کس طرح سراپا شکر و سپاس ہوں گے۔ آیت میں 'لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا' کا ٹکڑا بطور جملہ معترضہ ہے جس سے یہ اطمینان دلا دیا کہ یہ ذمہ داری اللہ نے اپنے بندوں پر ان کی حد وسع سے زیادہ نہیں ڈالی ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ایسا بوجھ ہے جو اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ ذمہ داری بس اسی حد تک ہے جس حد تک بندوں کے امکان میں ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِھِمۡ مِّنۡ غِلٍّ' اس ٹکڑے میں زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ایک سے زیادہ مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ بسا اوقات ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے 'فَالۡیَوۡمَ نَنۡسٰھُمۡ کَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ یَوۡمِھِمۡ ھٰذَا' (پس آج ہم ان کو بھلا

دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا، ظاہر ہے کہ یہاں بھلا دینے سے اس کا لازم یعنی عدم التفات مراد ہے، ورنہ اللہ کے کسی چیز کو بھلا دینے کے کیا معنی! وہ تو کوئی چیز بھی کبھی نہیں بھلاتا۔ اسی طرح فرمایا: 'فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ' (پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا) میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی میری نظر عنایت تم پر برابر رہے گی، ہر قدم پر تمھاری مدد کروں گا، اپنا ایک ایک وعدہ جو میں نے تم سے کیا ہے پورا کروں گا اور مزید برآں اپنے فضل ابدی سے نوازوں گا۔

اسی اسلوب پر یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے مراد اس کا لازم ہے یعنی اہل ایمان جنت میں ایک دوسرے سے تپاک اور محبت سے ملیں گے، ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے، آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں تبادلہ مہر و محبت کریں گے، ان کے درمیان کسی رنجش و کدورت کا شائبہ نہ ہوگا۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ' کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ یعنی وہ آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اس لیے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے۔ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھنا باہمی رنجش کی دلیل ہے اور آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی۔ قرآن نے یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے اہل جنت کی اسی حالت کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بات ٹھیک ٹھیک اہل دوزخ کی اس حالت کے مقابل میں بیان ہوئی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ وہاں تو آپس میں لعنتوں کا تبادلہ ہوگا، جوتیوں میں دال بٹے گی اور یہاں مجلس مہر و محبت کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔

منزل پر پہنچنے کے بعد اہل جنت کا جذبۂ شکر و سپاس

'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا' یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور پر صعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے۔ 'هَدَانَا لِهَٰذَا' میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبین حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مہیا فرماتا ہے۔ 'وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ' میں اس سفر کے پر صعوبت ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ اہل جنت کو جو کامیابی حاصل ہوگی وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے، اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔

'لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد یہ انبیاء و رسل کی عظیم خدمات اور ان کی کہی ہوئی ہر بات کی صداقت کا اعتراف ہے۔ یعنی اہل جنت رسولوں کی دی ہوئی ہر خبر کو واقعہ کی شکل میں دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا حرف حرف حقیقت ثابت ہوا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جن کی تکذیب اور جن کے استکبار کا اوپر ذکر ہوا۔

تکمیل نعمت کی معراج

'وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کے لیے منادی عام ہوگی کہ اس جنت کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے۔ اہل جنت کا خود اپنا احساس

تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ان کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے لیکن رب کریم اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کو نعمتیں حاصل ہوں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اس کی اپنی ہوں۔ اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔

ایک لطیف تلمیح اس آیت میں وراثت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایک لطیف تلمیح ہے اُس ماجرے کی طرف جو اوپر آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا مذکور ہوا ہے۔ وہاں یہ ارشاد موجود ہے کہ اولادِ آدمؑ میں سے وہی لوگ اپنے باپ کی اس جنت کے وارث ٹھہریں گے جو شیطان کی تمام فتنہ آرائیوں کے علی الرغم ایمان و عمل صالح کی صراط مستقیم پر قائم رہیں گے۔ یہاں اُوْرِثْتُمُوْهَا کا لفظ استعمال کر کے گویا شاباش دے دی کہ بے شک تم نے بازی جیت لی اور اب تم حقدار ہو کہ تم اس جنت کے وارث بنائے جاؤ۔

۶۔ آگے کا مضمون —— آیات ۴۴-۵۳

آگے وہ سوال و جواب مذکور ہوا ہے جس کا تبادلہ اہلِ جنت اور اہل دوزخ کے درمیان ہو گا۔ اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے ہوئے، تم بتاؤ، تم نے بھی وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا یا نہیں جس کی تمھیں خبر دی گئی تھی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں، سب دیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک منادی ان پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا۔

پھر یہ بیان ہوا کہ اعراف کی برجیوں سے رجال امت کے ایک گروہ کو جنت و دوزخ کے احوال کا مشاہدہ کرایا جائے گا کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ کے جن وعدوں کے لیے وہ جیے اور مرے وہ کس طرح پورے ہوئے۔ یہ اصحاب الاعراف اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کو ان کی علاماتِ امتیاز سے پہچانتے ہوں گے وہ اہلِ جنت کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں گے اور اہلِ دوزخ کے قائدین کو پھٹکاریں گے کہ بتاؤ تمھاری ساری جمعیت اور تمھارا سارا غرہ کیا کام آیا، تم قسمیں کھا کھا کے جن کے باب میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے، وہ کہاں ہیں اور تم کہاں بھاڑ جھونک رہے ہو؟

اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ اہل دوزخ پانی کے لیے تراہ تراہ کر رہے ہوں گے اور اہلِ جنت

سے فریاد کریں گے کہ کچھ ادھر بھی نظرِ کرم کرو لیکن وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے لیے ان چیزوں کی مناہی کر رکھی ہے۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ جنت و دوزخ کا جو احوال سنایا جارہا ہے، یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی تفصیل سنا دی ہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ اس ہدایت کو اختیار کر کے اپنے آپ کو رحمت کا سزاوار بنالیں لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے منتظر ہیں کہ جب یہ ساری باتیں واقعات کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گی تب ان کو مانیں گے لیکن وہ وقت ماننے کا نہیں ہو گا بلکہ سر پیٹنے کا ہو گا —— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۴۴-۵۳

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا

وقف لازم

ع ۵ / ۱۲

إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿۵۰﴾ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۳﴾

ع ۶ ۱۲

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۳

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے تو جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو بالکل سچا پایا، کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر ـــــ ان پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۴۴-۴۵

اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو ـــــ وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے ـ اور جب ان کو اہلِ دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو! اور برجیوں والے

کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے۔ کہیں گے، کیا کام آئی تمھارے تمھاری جمعیت اور تمھارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے! کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے! داخل ہو جنت میں، اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۴۶-۴۹

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے، جو اللہ نے تمھیں بخش رکھی ہیں، کچھ ہم پر بھی کرم فرمائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں — ان کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، پس آج ہم ان کو نظرانداز کریں گے جس طرح اُنھوں نے اپنے اس دن کی مُلاقات کو بُھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے — اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علمِ قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنھوں نے اس کو پہلے نظرانداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں!! انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے! ۵۰-۵۳

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ (۴۴)

جنت میں انسانی قوتوں کا عروج

یہ آیت ایک نہایت ہلکا سا تصور دیتی ہے اس انقلابِ حال کا جو جنت میں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر برپا ہو گا۔ اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں ہماری ان قوتوں کی راہ میں روک بنی ہوئی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہلِ جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے ان سے سوال و جواب کر لیں گے۔

اس سائنسی دور کے انسان کے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کرنے والی نہیں ہونی چاہیے۔ جب آج انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کا راز دریافت کر کے اپنے لیے ایسی دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے ہزاروں میل کی مسافت پر جلنے والی شمع کی لَو کو دیکھ سکتا ہے، ایسے فون بنا لیے ہیں جن کی وساطت سے جب چاہے پاکستان کا پریسیڈنٹ امریکہ کے پریسیڈنٹ سے بات کر سکتا ہے، ایسے ٹیلی ویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دُور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے، مجمع کو تالیاں پیٹتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سُن سکتے ہیں، ایسے آلات بنا لیے ہیں جو اس کو لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن سے آگاہ کر سکتے ہیں تو آخر اس عالم کی باتوں پر حیران ہونے کی کیا وجہ ہے جہاں یہ سارے نوامیس طبیعی، جو آج ہمیں جکڑے ہوئے ہیں، بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہو جائیں گے۔

اہلِ دوزخ کی تفضیح

اہلِ جنت کا یہ سوال اہلِ دوزخ سے جو یہاں نقل ہوا ہے، تبلیغ و تذکیر کے مقصد سے تو ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا وقت تو گزر چکا ہو گا، اس کا مقصد محض اہلِ دوزخ کی تفضیح ہو گا۔ اس کے جواب میں اہلِ دوزخ کا اعتراف گویا مجرم کا وہ آخری اعتراف ہو گا جس کے بعد اس کے اور اس کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک منادی ان ظالموں پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا اور یہ اعلان ہم معنی ہو گا اس کے کہ اب سزا اور عذاب کا باب شروع ہو گیا۔

ایک لطیف تضمین

'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۴۵'۔ عام طور پر لوگوں نے اس ٹکڑے کو منادی کے اعلان ہی کا ایک حصہ سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک منادی کا اعلان لفظ 'ظٰلِمِيْنَ' ہی پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹکڑا بطور تضمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے طور پر اس کے ساتھ

لگایا ہے تاکہ کلام محض مستقبل کی ایک حکایت بن کے نہ رہ جائے بلکہ حال پر بھی پوری طرح منطبق ہو جائے۔ اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہوگئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہوگئی، گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

اس قسم کی تضمینات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، آگے بھی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس کی ایک مثال آیت ۱۵ میں بھی آرہی ہے۔ انہی تضمینات سے بالعموم اصولی باتیں یا مستقبل کے ماجرے یا ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔ اس وجہ سے ان پر خاص طور پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے ورنہ نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تاویل میں ایسے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے جس سے نہ صرف ذوق ابا کرتا ہے بلکہ زبان کے آداب و قواعد بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں بھی جن لوگوں نے اس کو تضمین نہیں مانا انھیں 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ' کے ٹکڑے کی تاویل میں تکلف کرنا پڑا۔ انھوں نے اس کو 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ' کے معنی میں لیا حالانکہ یہ قرآن میں ایک قسم کا اضافہ ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ' میں 'صد' کا لفظ لازم اور متعدی یعنی رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ ایسے الفاظ کے ترجمے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کے باب میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اگر قرینہ واضح ہو تب تو قرینہ کے تقاضے کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیے ورنہ متعدی مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ اولیٰ ہے اس لیے کہ متعدی کے اندر لازم کا مفہوم خود مضمر ہوتا ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' میں کجی سے مراد اگرچہ وہ ساری کج رائیاں اور کج عملیاں ہو سکتی ہیں جو خدا کی راہ سے ہٹ کر انسان اختیار کرتا ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مفہوم خدا کی صراط مستقیم یعنی توحید کی راہ میں کجی پیدا کر کے شرک کی پگڈنڈیاں نکالنا ہے۔ ان نظائر کی وضاحت کسی مناسب محل میں انشاء اللہ تفصیل سے آئے گی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۶-۴۹)

'حجاب' سے مراد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار ہے

'وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ'۔ 'حجاب' سے مراد جیسا کہ خود قرآن کے دوسرے مقام سے واضح ہے، وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ حدید

میں ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ ۱۳- حدید (پس ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی) ایک ایسی دیوار کے طول و عرض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو پورے عالمِ جنت اور سارے عالمِ دوزخ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے گا جب کہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔

'اعراف' کا مفہوم

'اَعْرَاف' 'عُرْف' کی جمع ہے۔ 'عرف' گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا برجی یا دیدبان کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جائے، جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائے گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔

'رجال' سے مراد

'رِجَال' کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، ۳۷ نور (ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یا دالی سے غافل نہیں کرتی) مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۲۳- احزاب (اور اہل ایمان میں ایسے رجال ہیں جنھوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے انھوں نے باندھا) یہیں آیت ۴۸ میں بھی یہ لفظ ائمہ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (اور اعراف والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے پکاریں گے، کہیں گے بتاؤ کیا کام آئی تمھاری جمعیت اور کیا کام آیا تمھارا گھمنڈ)

'کُلًّا'۔ لفظ 'کل' ہم دوسرے مقام میں بتا چکے ہیں کہ جب یہ جماعتوں یا اشخاص کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے معرفہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد وہی گروہ یا اشخاص ہوں گے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ یہاں اوپر اہل جنت اور اہل دوزخ کا ذکر ہوا ہے چنانچہ اس سے مراد وہی دونوں گروہ بحیثیت گروہ ہیں۔

اہل جنت اور اہل دوزخ اپنی نمایاں علامتوں سے ممتاز ہوں گے

'سِیما' کے معنی علامت اور نشان کے ہیں مثلاً سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ قرآن مجید اور احادیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں اپنے اپنے اعمال کے اثرات سے ممتاز و ممیز ہوں گے۔ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی امت میں سے جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا، اگر ایک شخص کے پنج کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو پہچان نہ لے گا؟ لوگوں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ

پاؤں چمکتے ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی کے متعلق خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اس طرح کی رسی پڑی ہوئی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے بعض اشارات معراج سے متعلق احادیث میں بھی موجود ہیں۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ اہل ایمان ہوں یا اہل کفر دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے سے ممتاز ہوں گے اور اہل اعراف ان علامات کے واسطہ سے اہل جنت کے صدیقین، شہدا اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور اہل دوزخ کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے

اجزائے کلام کی تشریح کے بعد قابلِ غور سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟ ابن جریرؒ نے اس سوال کے جواب میں چار قول نقل کیے ہیں۔

ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں تول میں برابر برابر اتری ہوں گی، اس وجہ سے ان کا فیصلہ ابھی معلق ہوگا کہ دوزخ میں بھیجے جائیں یا جنت میں۔

دوسرا یہ کہ یہ علما اور فقہا کا گروہ ہوگا۔

تیسرا یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں حصہ لیا ہوگا۔

چوتھا یہ کہ یہ ملائکہ ہوں گے۔

ان میں سے موخر الذکر دونوں قول تو بالکل ہی بے جان ہیں۔ ان کی تائید میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے ان پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا قول اگرچہ بہت مشہور ہے یہاں تک کہ مصرعؒ "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است" ہمارے لٹریچر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر گیا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے یہ قول بھی ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہاں ان کے لیے 'رجال' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے مراد نمایاں اشخاص و رجال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اتنی بھی نہ ہوں گی کہ ان کی بدیوں پر بھاری ہو سکیں آخر ان کا ایسا نمایاں وصف کیا ہے جس کے سبب سے ان کا ذکر اس لفظ سے کیا گیا؟

دوسرا یہ کہ جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر برابر ہوں گی ضروری نہیں کہ وہ سب مرد ہی ہوں، ان میں عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ان کے لیے رجال کا لفظ کیوں استعمال ہوا، کوئی ایسا لفظ کیوں نہ استعمال ہوا جو جامع نوعیت کا ہوتا مثلاً طائفہ یا امت یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ؟

تیسرا یہ کہ یہاں کسی ایک لفظ سے بھی نہ تو یہ بات نکلتی کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ماجرا بیان ہو رہا ہے جس کا معاملہ ابھی معلق ہے اور نہ یہ بات نکلتی کہ ان کو اعراف کی یہ سیر کرانے سے مقصود کیا ہے حالانکہ موقع ایسا ہے کہ یہ بات واضح ہونی چاہیے تھی۔

چوتھا یہ کہ یہ لوگ اہل جنت اور اہل دوزخ کو جس انداز میں مخاطب کریں گے، ان کو مخاطب کر کے جو جو باتیں فرمائیں گے اور ان کے ساتھ جس اعزاز و اکرام کا معاملہ مذکور ہوا ہے وہ سب اس امر کے خلاف ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ذکر ہو جس کی اپنی نجات کا معاملہ ابھی معلق اور جس کی اپنی کارگزاری کی نوعیت یہ ہو کہ نیکی اور بدی دونوں برابر برابر ہو کر رہ گئی ہوں۔ قرآن کے بیان سے واضح ہے کہ یہ لوگ اہل جنت کو مبارکباد دیں گے، اہل دوزخ کے لیڈروں کو سرزنش اور ملامت کریں گے کہ تم دنیا میں بہت اتراتے اور اکڑتے رہے ہو، بتاؤ تمھاری جمعیت اور تمھارا سارا سرمایۂ غرور کہاں گیا؟ ان کو ڈانٹیں گے کہ تم خدا کی ساری نعمتوں کا اجارہ دار تنہا اپنے آپ کو سمجھتے تھے، غریب مسلمانوں کو کسی فضل کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے اب دیکھو تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہیں؟ آخر میں اہل جنت کو تمکن اور دوام و استمرار کی بشارت دیں گے۔ ——— غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں ایسے لوگوں کی زبان سے کس طرح نکل سکتی ہیں جنھیں خود اپنی نجات کی فکر پڑی ہو کہ معلوم نہیں مشیت غیب کیا فیصلہ کرتی ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں کسی مذبذب و متردد گروہ کے منہ سے نکل سکیں اور نہ اخلاقی پہلو سے یہ ایسے لوگوں کی زبان سے زیب ہی دیتی ہیں جن کے اپنے کارنامے کچھ زیادہ وقیع نہ ہوں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ قول اپنی شہرت کے باوجود کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ صحیح قول ہمارے نزدیک دوسرا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول مجاہدؒ کی طرف منسوب کیا ہے جن کا مرتبہ تفسیر میں معلوم و معروف ہے۔ مجاہدؒ نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علم بردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں۔ جنھوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے چوکے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ ایسے علماء و فقہاء یا بالفاظ دیگر رجال امت بلاشبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقائے حق کو مبارک باد دیں اور دشمنان حق کو سرزنش کریں۔ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ یہ لوگ اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے اہل جنت کو سلامتی و مبارکی کا پیغام دیں گے۔ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی سچائی ہر پہلو سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جنت میں داخل ہوں۔ وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ کے الفاظ سے ان کی تواضع جھلکتی ہے۔ باوجودیکہ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ مقام کیا ہے لیکن وہ اپنی تواضع و فروتنی کے سبب سے اپنے آپ کو امیدوار رحمت ہی کے درجے میں سمجھیں گے چنانچہ یہاں الفاظ ٹھیک ٹھیک ان کی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ

ملحوظ رہے کہ جو لوگ اللہ کی شانیں جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو امید اور طمع کے درجے سے اونچا کبھی نہیں نے جاتے، یہ تنگ ظرفوں کا شیوہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے میں بہک جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر فرماتے ہیں 'وَالَّذِیٓ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ' ۸۲۔ شعراء (اور وہ کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا و سزا کے دن میری غلطی معاف فرمائے گا) ہمارے حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، کوئی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ بھی؟ ارشاد ہوا ہاں میں بھی، 'اِلَّآ اَنۡ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحۡمَتِہٖ' میں بھی اسی وقت جنت میں جاؤں گا جب اللہ کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔

'وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُہُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ الآیۃ' یہ اسلوب بیان اکرام و اعزاز پر دلیل ہے۔ پہلے وہ اہل جنت کی کامرانیوں کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے اس لیے کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ من نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پھر اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنانِ حق کے انجام پر بھی ڈال لیجیے۔ ان پر نظر پڑتے ہی اُن کی زبان سے بے تحاشا تعوذ کی دعا نکلے گی 'رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ' (اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجیو) جس طرح اوپر 'وَہُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ' کے الفاظ سے ان کی تواضع و فروتنی پر عکس پڑتا ہے اسی طرح یہ دعا ان کے کمال خشیت کی بھی دلیل ہے اور جہنم کے منظر کی ہولناکی کی بھی۔

اصحاب الاعراف کا خطاب کفار کے لیڈروں سے

'وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ قَالُوۡا مَآ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ'۔

اصحاب اعراف کا یہ خطاب الفاظ سے واضح ہے کہ اہل دوزخ کے لیڈروں سے ہوگا اس لیے کہ اپنی جمعیت پر ناز اور اپنے مال و جاہ پر غرہ انہی کو تھا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشان سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہل اعراف پہچان جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے، یہ ابوجہل، یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کرکے اہل اعراف ان سے یہ سوال بطور تفضیح کریں گے۔ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہم نے یہاں 'مَا' کو سوالیہ مفہوم میں لیا ہے۔ اس میں زور بھی زیادہ ہے اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر بعد کا جملہ، جو اس سے متعلق ہے، واضح طور پر سوالیہ ہے بھی۔ اگر اس کو بعد والے جملہ سے الگ مفہوم میں لیں گے تو کلام میں ہم آہنگی باقی نہیں رہے گی۔

'اَہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُہُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ' یہ سوال ان ائمہ کفر سے، اہل اعراف ساکنین جنت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کریں گے کہ بتاؤ کیا یہی وہ لوگ نہیں ہیں جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی خدا کے کسی فضل کے سزاوار نہیں ہو سکتے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ سادات قریش اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل یہی لاتے تھے کہ اگر اس میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اس کے پیرو یہی فقیر، فاقہ کش اور غلام و نادار بنتے؟ خدا کی ساری نعمتوں کے سزاوار تو ہم بنائے گئے، پھر اس کے لیے ان کا انتخاب کیوں ہوا؟ اہلِ اعراف ان کے اسی غرور کو سامنے رکھ کر سوال کریں گے کہ فرماؤ، جن کو تم کسی فضل و رحمت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو؟

'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ'۔ اوپر والا سوال تو اہلِ اعراف ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کریں گے اور یہ بات وہ اہلِ جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت و تبریک کہیں گے جس سے برسرِ موقع ان کی توہین کرنے والوں کی تفضیح بھی ہو جائے گی۔

فعل تمکن و استمرار کے مفہوم میں

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اہلِ جنت تو بالفعل جنت میں براجمان ہوں گے ہی پھر ان کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ' (جنت میں داخل ہو) کہنے کے کیا معنی؟ غالباً اسی سوال سے بچنے کے لیے اربابِ تاویل نے اس جملہ کے مخاطب اور اس کے قائل کے تعین میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سارا تکلف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انھوں نے عربیت کے اس اسلوب کو ملحوظ نہیں رکھا کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا، بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھیے یہی 'اُدْخُلُوا' سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں بلکہ تبریک و تہنیت اور تمکن و استمرار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ (۹۹۔ یوسف)	پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو انشاء اللہ امن کے ساتھ۔

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت یوسفؑ کے سارے بھائی، ان کی ہدایت کے بموجب، اپنے والدین کو ساتھ لے کر، حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے اپنے دربار میں ان کی پذیرائی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے مصر میں داخل ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ مصر میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ ان کے والدین حضرت یوسفؑ کے پہلو میں فروکش اور یہ تمام بھائی حضرت یوسفؑ کے دربار میں موجود تھے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ 'اُدْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ' صریحاً تبریک و تہنیت اور بشارت تمکن کے مفہوم ہی میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک اسی مفہوم میں اصحاب اعراف کا اہلِ جنت کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ' فرمانا بھی ہے۔ یعنی مال و جاہ کے غرور کے متوالے تو تمھیں نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ نے ان کے علی الرغم تمھیں جنت کی سرفرازی بخشی۔

تم اس میں سرفراز رہو، اب نہ تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۰)

لفظ تحریم کا ایک خاص مفہوم

'حَرَّمَهُمَا' میں جس تحریم کا ذکر ہے یہ شرعی حرمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس معنی میں ہے جس معنی میں 'فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۲۶- مائدہ ۵' (پس یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی) میں ہے۔ یعنی چالیس سال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حتمی طور پر اس سرزمین سے محروم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کسی چیز سے حتمی طور پر محروم کر دے تو نہ وہ چیز کسی طرح اس کو پہنچ سکتی اور نہ وہ اس کو کسی طرح پا سکتا۔ اہلِ جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سوال کے پورے کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے، ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے اہلِ دوزخ کو محروم کر دیا ہے اس وجہ سے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۵۱)

ایک برمحل تضمین

یہ آیت بطور تضمین ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے جواب 'حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ' کی وضاحت اپنی طرف سے فرما دی کہ 'کافرین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس تضمین سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا۔ گویا قریش پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف دوسروں کی حکایت ہے بلکہ یہ ان کی بھی حکایت ہے۔ اس قسم کی تضمین کی مثال اوپر آیت ۴۵ میں بھی گزر چکی ہے۔

'الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا' یعنی اللہ نے جو چیز ان پر دین کی حیثیت سے اتاری اس کو انھوں نے ہنسی مسخری میں اڑا دیا۔ ہر چیز کا ایک محل و مقام ہوتا ہے۔ دین اس لیے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطۂ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں۔ لیکن جن لوگوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ خواہشات کے خلاف سنجیدہ سے سنجیدہ حقیقت کو بھی مذاق تصور کرتے اور مذاق ہی میں اس کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بازی بازی بار یش بابا ہم بازی!!

منکرینِ آخرت کا اصل دھوکا

'غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا' یہ اس لاابالیانہ طرزِ عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کوئی باز پرس ان سے نہیں ہو رہی ہے اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس دنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو توجہ دلائی کہ اس کے بعد ایک روزِ حساب کتاب بھی آنے والا ہے تو اس کے لتے لے ڈالے کہ یہ دیوانہ اور خبطی ہے۔ ہماری آزادی اور ہمارے عیش کو مکدر کر رہا ہے۔

'فَالْیَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا' یہاں 'نَنْسٰهُمْ' نظر انداز کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ فعل کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ استعمال بظاہر فعل ہوتا ہے لیکن مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں۔ یہ بھولنا نظر انداز کرنے کی تعبیر ہے۔

'لِقَآءَ' قرآن کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوا ہے، کہیں اپنے ظرف کی طرف لیکن مدعا دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی رب سے ملاقات آخرت میں۔ انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا، یعنی اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔

'وَمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ' یہ جملہ چونکہ اوپر والے جملے ہی پر عطف ہے اس وجہ سے یہ دراصل 'كَمَا كَانُوْا' کے مفہوم میں ہے۔ 'کما' کے اندر تشبیہ و تمثیل کے ساتھ ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ 'اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے'، تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ ؕ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (۵۲-۵۳)

کتابِ الٰہی کی شکل میں قریش پر عظیم احسان

'وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ' 'ھُمْ' کا مرجع قریش ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار فرمایا ہے جو قرآن کی صورت میں ان پر فرمایا۔ اس کتاب کی صفت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ان تفصیلات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اوپر اہلِ جنت، اہلِ دوزخ اور اصحاب الاعراف سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ جو ہیں اگرچہ عالمِ آخرت سے متعلق لیکن کوئی ان کو محض ہوائی اور خیالی باتیں (FICTIONS) نہ سمجھے بلکہ یہ پیش آنے والے حقائق ہیں جو تمام تر 'عَلٰی عِلْمٍ' بیان ہوئے ہیں۔ یہاں لفظ 'علم' کی تنکیر موقع کلام دلیل ہے کہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی یہ خدا کے عظیم و وسیع، محیط کل علم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر بات قطعی اور اٹل ہے۔ خدا قیامت کے روز کی باتیں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح کل اور آج کی باتیں جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نے ان کو خیالی باتیں قرار دے کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ سوچ لے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک ایک بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور پکار اٹھے گا کہ اللہ کے رسول نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی سب سچی ثابت ہوئیں۔

'هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ' ہدایت و رحمت کے دو لفظوں نے آغاز و انجام اور دنیا و آخرت دونوں

کو سمیٹ لیا ہے۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کے لیے دنیا میں ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے کا ثمرہ آخرت میں رحمت ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ فعل، جیسا کہ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیجیے۔ 'ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں'۔

'ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ' 'تاویل' کے لفظ پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں جو قرآن سنا رہا ہے ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی یہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے منکرین ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں تو ان کو دیکھ کر یقین کریں گے۔

'یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' مطلب یہ ہے کہ جب یہ باتیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں گی تو آج جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہمیں آگاہ کیا تھا وہ سب حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس وقت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ ہے کوئی سفارشی جو ہماری سفارش کرے یا ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں پھر جائیں اور کچھ نیکی کمائیں! لیکن ان کی یہ حسرت حسرت ہی رہے گی اس لیے کہ نیکی کی کمائی کا وقت نکل چکا ہو گا۔ جو وقت ان کو نیکی کمانے کے لیے ملا اس میں انھوں نے بدی کمائی اور جھوٹے سفارشیوں پر تکیہ کیے رہے۔ 'قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ' زندگی کی اصلی قیمت، جیسا کہ سورۂ العصر میں واضح فرمایا ہے، یہی ہے کہ اس میں نیکی کمائی جائے۔ جس نے نیکی نہ کمائی اس کی زندگی وبال بنی اور اس نے بڑے قیمتی سرمایہ سے اپنے لیے تباہی کا سودا کیا۔ 'ضَلَّ عَنْهُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی معبود سب خواب و خیال ثابت ہوں گے اس لیے کہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ تھی ہی نہیں کہ انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کے ان کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک و شفیع بنایا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ——— آیات ۵۴-۵۸

اوپر بات شرک کی بے حقیقتی و بد انجامی پر ختم ہوئی تھی۔ آگے کی آیات میں توحید کے مضمون کی وضاحت فرما کر اس کی تکمیل کر دی کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور وہ اس کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر تمام کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ دن اور رات، سورج اور چاند، ستارے اور سیارے سب اسی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز گردش میں ہیں۔ جس نے خلق کیا ہے اسی کا امر و حکم تمام کائنات پر جاری ہے اور خالق کائنات کے سوا دوسرا کوئی حق دار کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا کی خلق کی ہوئی کائنات میں اس کا حکم چلے؟ پھر یہ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے

کہ اس کو خلق کرنے والی ہستی بڑی ہی بافیض اور نہایت ہی بابرکت و رحمت ہستی ہے تو سراً و علانیۃً اسی کو پکارو اور امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ۔ خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گردانا خدا سے بغاوت اور اس کی سرزمین میں فساد برپا کرنا ہے اور خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس سے سرتابی کریں اور اس کی زمین میں فساد مچائیں۔

اس کے بعد بارش کی ایک تمثیل پیش کی ہے جس سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکوکار بندوں سے بہت قریب ہے اس وجہ سے امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا اور اس کی رحمت کو دور سمجھ کر دوسروں کا سہارا نہیں پکڑنا چاہیے۔ یہ خدا ہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے اور تمہارے مایوس ہو جانے کے بعد اپنی رحمت کی گھٹائیں اٹھاتا اور تمام زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمہارے مرکھپ جانے کے بعد تمہیں از سر نو زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکل میں نمایاں ہوتا ہے، زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، بنجر زمین صرف خار و خس اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش اس زمین پر نازل ہوئی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی، جنھوں نے اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچایا ہے وہ اس سے فیض پائیں گے اور ان کے دل نور ایمان سے جگمگا اٹھیں گے لیکن جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ان کے اندر صرف کفر و عناد کی جھاڑیاں اگیں گی۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۴-۵۸

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

ع ۵ ۱۴

ترجمۂ آیات ۵۴-۵۸

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب! اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔ ۵۴-۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابرِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز

زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں۔ ۵۷-۵۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ قف يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا لا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِأَمْرِهٖ ط أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۴)

جو خالق ہے وہی رب ہے

'إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا خلق کر کے اس کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے دوسرے کارندوں میں تقسیم کر دیے ہیں اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے۔ وہی خدا کے قرب کا واسطہ ہیں اور رزق و فضل اور مال و اولاد کے خزانوں پر عملاً انہی کا تصرف ہے۔ اگر ان کو نہ راضی رکھا جائے تو اکیلے اللہ تعالیٰ سے کام نہیں چل سکتا۔ انہی کارندوں کو وہ ارباب، شرکاء اور شفعاء کا درجہ دیتے تھے اور گو نظری طور پر ان کی میتھالوجی میں خدا کو خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت حاصل تھی لیکن عملاً ان کی ساری وابستگی رب الارباب سے نہیں بلکہ ان فرضی ارباب ہی سے رہ گئی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی گمراہی پر ٹوکا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، وہی رب بھی ہے، جب خالق وہ ہے اور اس سے تمہیں انکار نہیں تو دوسروں کو رب کس منطق سے بنائے بیٹھے ہو۔

تخلیق کائنات میں تدریج وارتقا کی حکمتیں

'فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' میں ایام سے مراد یہ ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن نہیں ہیں بلکہ اس سے خدائی دن مراد ہیں۔ خدا کی اسکیمیں اس کے اپنے دنوں کے حساب سے بروئے کار آتی ہیں جو ہمارے حساب سے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہیں۔ دنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقا کا تعلق ہے فلسفۂ جدید بھی بڑے شد و مد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقا قدیم و جدید میں متنازع فیہ نہیں ہے البتہ نظریۂ ارتقاء کی تقریر اس

کے علم برداروں کی طرف سے جس انداز میں کی جاتی ہے اس میں بہت سے منطقی خلا ہیں جو اس وقت تک نہیں بھر سکتے جب تک ان عقلی و فطری اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے جو قرآن نے اس ارتقا کے بیان فرمائے ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس کے محل میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو چھ دنوں، یا چھ ادوار میں پیدا کرنے کے بجائے اپنے ایک کلمۂ کُن سے آن کے آن میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی قدرت سے بعید نہیں تھی۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہُوا کہ یہ چھ ادوار میں پیدا ہو۔ خدا نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمالِ عقلی و روحانی کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمالِ قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ ہم نے سورۂ انعام کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہِ راست آسمان سے روٹی برستی پھر یہ کیوں ضروری ہُوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپجے، خوشے نمودار ہوں، پھر ان میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اس کے عجائبِ قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے اگر آنکھیں کھلی ہُوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفتِ الٰہی کا ایک دلبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم ان کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ جو حال اس دنیا کے ذرے ذرے کا ہے وہی حال بحیثیت مجموعی اس دنیا کا ہے یہ بھی ایک حادثہ کے طور پر یک بیک بن کر نہیں کھڑی ہوگئی ہے بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے نے بڑی تدریج و حکمت اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف مراحل میں اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ وہ انسان کے فردکش ہونے کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہوگئی۔ یہ اہتمام و تدریج شاہد ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ایک باغایت و با مقصد کارخانہ ہے اور ضرور ہے کہ ایک دن وہ غایت و مقصد ظہور میں آئے۔ اس نکتہ پر مفصل بحث ہم سورۂ ہود کی آیت ، کے تحت کریں گے جہاں اسی اہتمام کے پہلو سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔

تخلیقِ کائنات میں جو اہتمام ہے اس کا بدیہی نتیجہ

'ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' یہ اس شان و اہتمام کے ساتھ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا ایک بدیہی نتیجہ بیان ہُوا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا سنوارا کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ

ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہ 'استوٰی علی العرش' کے ساتھ 'یُدَبِّرُ الْاَمْرَ' بھی آیا ہے۔ خدا خلق تو کرے لیکن پھر اس کا انتظام نہ کرے یہ خدا پر نہایت ہی سفیہانہ تہمت ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے، اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے، مفسدین [illegible] ہیں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری خلق اس کو نالائق بادشاہ کہے گی، پھر ایک معمولی بادشاہ کے لیے جو بات عیب میں داخل ہے آسمان و زمین کے خالق و مالک کے لیے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے؟ یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی تردید ہے کہ خدا خالق تو ہے لیکن آسمان و زمین کو خلق کر کے اس نے عالم کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے شرکاء کے حوالے کر دیا ہے اور خود الگ تھلگ جا بیٹھا ہے۔ ساتھ ہی یہ ان کم سواد فلسفیوں کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک گوشہ نشین علت العلل کا درجہ دیتے ہیں جس نے محرک اول کی حیثیت سے ایک حرکت تو پیدا کر دی لیکن پھر اس کو اس سے کچھ بحث نہیں رہی کہ اس کی اس حرکت کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اس کو کنٹرول کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور کائنات کا انتظام فرما رہا ہے۔ عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور استواء کے بعد جب 'علیٰ' آتا ہے تو اس کے معنی تمکن کے ہو جاتے ہیں۔

'یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا'۔ 'حثیث' اور 'حثوث' کے معنی تیز اور سرگرم کے ہیں۔ یہ اس تدبیر و انتظام کی وضاحت ہو رہی ہے جو 'اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' کے اندر مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق ہی کی تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ 'وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِہٖ' وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کیے۔ 'مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِہٖ' یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ایک پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنے حدود سے متجاوز۔

جو خالق ہے اسی کو حکومت کا حق ہے

'اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ' بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے، ذرہ ذرہ شب و روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے اور یہی حق بھی ہے کہ اسی کا امر و حکم اس کے ہر گوشے میں چلے اس لیے کہ جس نے خلق کیا ہے اس کے سوا کسی اور کا حکم اس میں چل کس استحقاق کی بنا پر سکتا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ 'حَثِیْثًا' کے لفظ سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ ہر چیز پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہی ہے، کسی چیز سے بھی نیم دلی یا سرد مہری کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کے لیے بھی خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے یہی رویہ زیبا ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت میں اسی طرح سرگرم ہو۔ دوسری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں رات کی سرگرمی کا ذکر تو فرمایا لیکن دن کی سرگرمی کا ذکر نہیں فرمایا درآنحالیکہ دوسرے مقام میں رات کے ساتھ دن کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲ - الفرقان اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں رات کے ذکر کے بعد سورج کا ذکر آگیا ہے جس سے مقابل پہلو خود بخود واضح ہو گیا۔

خدا اپنے جلال اور رحمت دونوں میں یکتا ہے

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، تفاعل میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے 'تبٰرک اللہ' کے معنی ہوں گے، بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ۔ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح خدا کی قدرت و عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ خدا کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسایط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو، جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۚ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۵ - ۵۶)

خدا سے دعا کے آداب

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، 'تضرّع'، 'ضراعت' سے ہے۔ اس کے معنی عاجزی، خوشامد، لجاجت، تملّق کے اظہار کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ اس کی سب سے زیادہ موثر شکل وہ ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہو جس کی بہترین شکل اسلام میں نماز ہے۔ باوضو ہو کر مودب کھڑا ہونا، ہاتھ باندھ لینا، سر جھکا

دینا، گھٹنے ٹیک دینا، ناک اور پیشانی خاک پر رکھ دینا، یہ تضرع کی حرکات اور ادائیں ہیں اور ان مختلف حرکات اور اداؤں کے ساتھ جو دعائیں اور تسبیحات پڑھی جاتی ہیں یہ سب اسی تضرع کی معنوی تعبیریں ہیں۔

'خُفْیَۃً' کے معنی 'چپکے' کے ہیں۔ یہ تضرع کے آداب میں سے ہے جو تضرع کے اخلاص کا بھی ضامن ہے اور اس کے وقار کا بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس وجہ سے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'خفیۃ' کا لفظ صرف ریا اور سوء ادب کے سدباب کے لیے ہے۔ اس سے اس جہر کی نفی نہیں ہوتی جو جماعتی دعاؤں یا بعض اوقات بندہ اپنی انفرادی مناجاتوں میں اختیار کرتا ہے۔ یہ جہر کی نفی نہیں بلکہ صرف اعتدال کی تاکید ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انشاء اللہ بنی اسرائیل کی آیت 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۱۱۰' کے تحت آئے گی۔

انسان کو نظام کائنات کا درس

الفاظ کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں، خلق اور امر سب اسی کے اختیار میں ہے اور وہ بڑی ہی بافیض و بابرکت ہستی ہے۔ اب یہ 'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ' سے وہ حق اور فرض بیان ہو رہا ہے جو اس رب عظیم و کریم کا بندوں پر عاید ہوتا ہے۔ وہ حق و فرض یہ ہے کہ اپنے اسی رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یعنی یہ استکبار اور یہ رعونت جس کا اظہار تمھاری طرف سے ہو رہا ہے یہ روش تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سرافگندہ و سرنگوں اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہے تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ خدا کے آگے اکڑو اور سر اٹھاؤ۔ 'اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ'۔ خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس کے حدود سے تجاوز کریں۔ یہ نظام کائنات شاہد ہے کہ وہ کسی چیز کو اس کے حدود سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا اور اس دنیا کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اس نے کبھی اکڑنے والوں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ایک حد خاص سے زیادہ مہلت نہیں دی۔

تکوینی توحید کی طرح تشریعی توحید بھی لازمی ہے

'وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے ہے۔ یعنی اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرہ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و اطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت و اطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس